اُردو شیرازہ

تاریخ وتمدن

بیادِ رفتگاں

جموں وکشمیر میں معاصر اُردو افسانچہ نگاری

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

اُردو شیرازہ
Number: 9 - 10 (September October 2024)
Volume: 62

ISSN: 2277-9833

Urdu Sheeraza

Volume: 62
Number: 9 - 10 (September - October 2024)

Jammu & Kashmir
Academy of Art, Culture and Languages

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

نِگراں : ہروندھر کور (جے کے اے ایس)

مدیر : محمد سلیم سالکؔ

معاون مدیر : سلیم ساغرؔ

معاون : ڈاکٹر محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگو یجز

ناشر: سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگو یجز
کمپیوٹر کمپوزنگ / سرورق:......امتیاز احمد شرقی
سال اشاعت: جلد؛62،شمارہ:10-9 (ستمبر-اکتوبر 2024)
ISSN نمبر:2277-9833
قیمت: 100 روپۓ

''شیرازہ'' میں جو مواد شامل کیا جاتا ہے اُس میں ظاہر کی گئی آرا سے
اکیڈمی کا کُلاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔   (ادارہ)

● ...... خط و کتابت کا پتہ:
مدیر ''شیرازہ'' اردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگو یجز
سرینگر / جموں
ای میل: sherazaurdu@gmail.com

فہرست

●●●

گفتگو بند نہ ہو!

موجودہ دور میں زندگی کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ ایک زمانے میں تفریح کا واحد ذریعہ داستانیں ہوا کرتی تھیں، شائقین باقاعدہ داستانیں سننے کے لئے داستان گو کو معاوضہ دیا کرتے تھے اور گھنٹوں اس کے گرد دائرہ بنا کر ہمہ تن گوش داستان سنتے تھے۔ پھر زمانے نے کروٹ بدلی اور داستان کی جگہ ناول نے لی۔ اب قارئین نے جلوت کی بجائے خلوت کو ترجیح دی۔ ابھی ناول نگاری نے ابتدائی منزلیں ہی طے کی تھیں کہ افسانے نے دستک دی اور ایک اصطلاح یوں وضع ہوئی کہ ناول میں زندگی کی پوری حقیقت سما سکتی ہے جبکہ افسانے میں زندگی سے جڑے صرف ایک واقعہ کی عکاسی ہوتی ہے۔ افسانہ ایک صدی کی تاریخ سمیٹنے میں کوشاں تھا کہ افسانچے نے باقاعدہ اپنی آمد کی اطلاع دی۔ یہاں پر ایک بات قابلِ غور ہے کہ داستانیں، داستان گو کی مرہونِ منت تھیں، ناول نگاری نے پڑھے لکھے طبقہ میں اپنی محفوظ پناہ گاہ ڈھونڈنے کی سعی کی۔ افسانے نے رسائل و جرائد کے ذریعہ اپنے تحفظ کو یقینی بنایا جبکہ افسانچہ کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس کو سوشل میڈیا نے بے پناہ وسعت سے لبریز پلیٹ فارم دیا، جس کے طفیل افسانچہ مختصرترین ہونے کے باعث ایک مقبول صنف کے طور منظرِ عام پر ابھرا۔

افسانچہ کی تعریف وتوضیح میں ایک کلیدی بات یہ ہے کہ اس میں مختصر ہی سہی لیکن ایک مکمل قصہ ہونا چاہئے۔ جب ایک قصہ رونما ہوتا ہے تو اس میں قصے کی شعریات کا ہونا بھی لازمی ہے۔ یہاں پر یہ نکتہ قابل بحث ہے کہ کیا افسانچہ اپنے اختصار کے باوجود ایک جامع اور اثر انگیز اظہاریہ بن سکتا ہے یا نہیں؟

ایک بات طے ہے کہ معیاری افسانچہ وہی تخلیق کرسکتا ہے جو ایک مکمل افسانے لکھنے کی استعداد اور صلاحیت رکھتا ہو۔افسانچہ لکھنے میں ایک خرابی یہ ہے کہ اگر افسانچہ صحیح معنوں میں Concieve نہیں ہوا ہو تو افسانچہ ابارشن کے تکلیف دہ مراحلے سے گزر کر ایک المیہ کی شکل اختیار کرے گا۔اس پر طرہ یہ ہے کہ کبھی کبھار افسانچہ نگار کی غیر سنجیدگی سے معاملہ اتنا بگڑ جاتا ہے کہ افسانچہ ایک لطیفہ کی شکل اختیار کر کے قارئین کے لئے ایک معمہ بن جاتا ہے۔بعض حضرات اپنے نام نہاد فلسفے کو افسانچہ کے لبادے میں پیش کر کے سماج میں اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔بہر حال، افسانچہ ایک ادبی صنف کے طور پر تخلیق کیا جاتا ہے،اس لئے جو اصول وقواعد تخلیقی ادب کے لئے طے پا گئے ہیں،انہیں افسانچہ کے لئے بھی معیار سمجھا جانا چاہئے۔

اس میں دو رائے نہیں کہ ڈجیٹل پلیٹ فارمز نے جہاں ایک طرف قارئین کو نئے مواقع فراہم کئے، وہیں دوسری طرف لکھنے والوں کے لئے بھی اپنے افکار اور تخلیقی صلاحیتوں کو وسیع پیمانے پر پیش کرنے کا راستہ ہموار کیا ہے۔موجودہ دور میں قارئین مختصر مواد کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔فیس بک، انسٹاگرام، ٹوئٹر، اور واٹس ایپ جیسے پلیٹ فارمز پر مختصر کہانیاں اور افسانچے تیزی سے مقبول ہو رہے ہیں۔افسانچہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ چند جملوں میں ایک مکمل کہانی بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا ہے کہ اب قارئین کے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا ہے اور افسانچہ اپنے اختصار کی وجہ سے بہت کم وقت میں پڑھا جا سکتا ہے۔سوشل میڈیا پر لکھنے والے اپنی مختصر تحریریں فوری طور پر اپلوڈ کرتے ہیں، جو انہیں قارئین کے وسیع حلقوں میں متعارف کراتی ہیں۔افسانچے کو تصاویر، گرافکس اور ویڈیوز کے ساتھ پیش کر کے اس کی تاثیر میں اضافہ کیا جاسکتا ہے، جو آج کل سوشل میڈیا پر ایک مقبولِ عام ٹرینڈ ہے۔

ساتھ ہی اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ نوجوان نسل، جو کتابوں

سے دور ہوتی جارہی تھی، اب سوشل میڈیا پر افسانچے لکھنے یا پڑھنے میں دلچسپی لے رہی ہے۔اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ قارئین کی جانب سے فوری رائے موصول ہوتی ہے، جو لکھاری کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوتی ہے۔لیکن کبھی کبھار غیر معیاری افسانچوں کو بھی بے جا سراہنا ملتی ہے اور تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں، جس سے سنجیدہ لکھنے والے مایوس ہوتے ہیں۔

اس سب صورتِ حال کے پیشِ نظر ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ جموں وکشمیر میں معاصر اردو افسانچوں کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جائے تا کہ مستقبل قریب میں جموں وکشمیر کے تناظر میں اردو افسانچوں کی ایک مستند تاریخ مرتب کرنے کے سلسلے میں پیش رفت کی جاسکے۔اس سلسلے میں ہم نے مقامی افسانچہ نگاروں کے تین تین افسانچے شاملِ انتخاب کئے ہیں تا کہ اس بات کا اندازہ کرنا ممکن ہو کہ ہمارے یہاں افسانچہ لکھنے والوں کی تعداد کتنی ہے اور کس نوعیت اور معیار کے افسانچے تخلیق کئے گئے ہیں ۔شیرازہ کے پلیٹ فارم پر پہلی بار افسانچوں کا ایک انتخاب پیش کیا جارہا ہے۔اس لئے امید کرتے ہیں کہ ''جموں وکشمیر میں اردو افسانچہ نگاری'' کے موضوع پر ایک سنجیدہ مکالمہ قائم ہوگا۔

''تاریخ وتمدن'' کا سلسلہ حسبِ سابق جاری ہے۔شمارہ ہٰذا میں ڈاکٹر آفاق عزیز نے ''سرینگر'' کی وجہ تسمیہ پر سیر حاصل بحث کر کے کشمیر کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دینے کی کوشش کی ہے، جو کشمیر کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے بہت اہمیت کا حامل موضوع رہے گا۔ امید ہے کہ قارئین حسبِ سابق اس شمارے کے مشمولات پڑھ کر اپنے تاثرات سے ہمیں آگاہ فرمائیں گے۔

مدیر

شیرازہ اردو

☆......ڈاکٹر آفاق عزیز

سرینگر کی وجہ تسمیہ: تاریخی حقائق کی گرہ کشائی

کسی موضوع پر قلم اُٹھاتے وقت کثیر شعبہ جاتی اصولوں پر مبنی تحقیق کی ترجیح لازمی ہے جو حوصلہ بخش ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ بیشتر تحقیقی کاموں میں کثیر ضوابط پر مبنی اصولوں کا بہت کم چلن رہا ہے جس کے باعث کئی تحقیقی غلطیاں سرزد ہوکر تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں، جن کو درست کرنا مشکل نہیں لیکن عام لوگوں کے دلوں میں بیٹھی اور بٹھائی گئی غلط فہمی کو دور کرنا یقیناً جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ بطورِ مثال ایک بڑی غلطی یہ بعض قلم کاروں سے سرزد ہوئی ہے جنھوں نے بغیر کسی دلیل ''چنار'' جسے شاہی درخت کہا جاتا تھا' کے متعلق یہ کہ پندرہویں صدی عیسویں میں چنار وسطِ ایشیا سے کشمیر لایا گیا۔ اس ناقص بیان سے'' تاریخ تومسخ ہوہی گئی، نیز تاریخی اور ثقافتی اقدار کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اگر کشمیر کے قدیم ادبی کارناموں کو کھنگالا ہوتا، 'بونی''اور''چنار'' کے ساتھ ساتھ کشمیر کے لسانی ارتقا کا مطالعہ کیا ہوتا، چنار اور بونی کی بناوٹ اور طبعی عمر پر گہری نظر ڈالی ہوتی تو جذباتی بیانات سے بچا جاسکتا تھا۔ اس طرح کشمیری پھیرن، کانگڑی، شال، واز وان، نانوائی حتیٰ کہ کشمیری فلسفے وغیرہ کو بھی من گھڑت نظریات نے گھیر لیا ہے۔ ایسی غلطیوں سے بچنے کا راز بہرحال کثیر العلوم اصولوں کی عمل آوری میں ہی مضمر ہے۔

اس راہ پر گامزن ہوکر اگر سرینگر لفظ کا تحقیقی مطالعہ کثیر شعبہ جاتی نظم وضوابط

کے تحت کیا جائے تو بہتر اور کثیر المقاصد نتائج کا برآمد ہونا خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی لفظوں کی اپنی تاریخ ہوتی ہے اوران میں بہت کچھ پنہاں ہوتا ہے۔ جس طرح ماہرین آثار قدیمہ، ہڈیوں اور برتن کے ٹکڑوں سے تاریخ کی شیرازہ بندی کرتے ہیں، اُسی طرح ماہرین لغت الفاظ کے مطالعہ کی مدد سے تاریخ کے جھروکوں میں جھانک کر ماضی کے بعض تاریک گوشوں پر روشنی ڈالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں[1]۔

اگر تحقیق کے ان اصولوں کو مذکورہ نظامِ تحقیق کے عین مطابق بروئے کار لاکر سرینگر لفظ کے زاد بوم، معنی، بناوٹ اور تاریخ وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے تو زیر بحث مقالے سے منسلک ہر پہلو یقیناً منکشف ہوسکتا ہے۔ ان سبھی پہلوؤں کو کھنگال کر جانچنے، سمجھنے اور پرکھنے کی اشدّ ضرورت ہے اور اہمیت بھی۔ اِن اہداف کو تحقیق وتنقید کے مراحل سے گُزارے بغیر حاصل کرنا ناممکن ہے۔

سرینگر: لفظ کی بناوٹ:

یہ مُسلّمہ حقیقت ہے کہ زبان اور اس کے الفاظ ''قومی'' تاریخ کا اہم ترین سرمایہ ہے جس میں ایام گزشتہ کی روداد تہہ در تہہ محفوظ ہوتی ہے۔ کوئی بھی لفظ چاہے وہ کس شے، نباتات، جمادات یا کسی مقام سے وابستہ ہو، خاموش تاریخ کا حصہ ہوتا ہے۔ جب کبھی ان الفاظ سے چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے تو ایسے سربستہ رازوں سے پردہ ہٹنے لگتا ہے جن کا وہم وگمان میں آنا مشکل ہے۔ اسی نظریہ کے تحت اگر ''سرینگر'' لفظ کا مطالعہ بناوٹ کے اعتبار سے کیا جائے تو بہتر نتائج ممکن ہیں۔ سرینگر ایک مرکّب لفظ ہے جو قواعدی لحاظ سے دو مارفیم یا دو آزاد اکائیاں یعنی سری اور نگر ہیں[2]۔

سری:

جہاں تک سری (Sri) اکائی کا تعلق ہے، اس کی کئی صورتیں ہیں جس میں

سرّ ی(Sr-ri) ٗشری(Shri)اورشرِّ ی(Shr-ree) قابل ذکر ہیں۔معنیاتی اعتبار سے ان سبھی مارفیموں میں تقریباً یکسانیت پائی جاتی ہے۔لیکن ساختی طور ان میں معمولی تفاوت نُمایاں ہے۔ ہئیت کی بات ہوتو مذکورہ مارفیموں میں اس کی بھر پور عکاسی ہوتی ہے۔ اگر سری (Sri) کو بُنیادی مارفیم ٹھہرایا جائے تو سرِّ ی، شری اور شرّ ی اس کی مُشتق شکلیں ہیں جن کو دوران زمانہ صوتی اوراچھری تبدیلیوں سے گُزرنا پڑاہے۔ بعض تجزیہ نگاروں کے نزدیک''ر''(R)اور''ری''(Ree) غیر معیاری لاحقے ہیں[۳]۔اس کے باوجود مذکورہ بالاشکلیں بغیرکسی معنوی تبدیلی کے بدستوراستعمال میں رہی ہیں۔لُغت نویس رقم طراز ہیں:

"Shree, Sri or Sree, is an Indian word who denoting wealth and prosperity primarily used as an honorific"4

سری(Sri)ایک ایسا لفظ ہے جوٹھوس شئے کی بجائے کسی نظریہ،معیار یا حالت کی نشاندہی کرتا ہے۔اس پس منظرکوذہن میں رکھتے ہوئے سنسکرت لُغت میں سری لفظ کو روشنی، اچھائی، خوبصورتی، شان وشوکت،عظمت،قسمت، طاقت،فلاح وبہبود، کامیابی، دولت، اونچادرجہ،شاہی وقاراورشخصی رُتبہ وغیرہ کے معنی دیئے گئے ہیں[۵]۔لسانی محقق آر۔ایل ٹُرنر(1933-1888) نے سری لفظ کے فعلی معنی، پکانا، جلانا،اُبالنااورروشنی پھیلانا درج کئے ہیں [۶]۔تاہم انہوں نے ایک اور جگہ سری لفظ کےحوالہ سےمونیر ولیمز کےخیالات کویوں فوقیت دی ہے:

"....but as a feminine abstract noun, it (Sri) has received a general meaning of grace splendour , beauty, wealth,affluence and prosperity".7

زمانہ گزرتا گیا اور ''سری'' لفظ کے ساتھ مزید معنی جُڑتے گئے یعنی یہ لفظ ''عزت واحترام'' اور خطاب کے طور بھی استعمال ہوتا رہا[8]۔ سری اور شری وغیرہ لفظی صورتیں دیوتاؤں، راجاؤں اور نامی کتابوں کی تعظیم کے لئے استعمال ہوئیں[9] اور یہ اعزازی بلکہ عقیدتی الفاظ آج بھی مروج ہیں۔

مذکورہ بالا معنوی تجزیہ سے سری اور شری لفظوں کے دو گروہ سامنے آئے۔ فعلی گروہ اور صفتی گروہ۔ اوّل الذّکر پکانا، جلانا، اُبالنا اور روشنی پھیلانا جیسے لفظوں پر مشتمل ہے اور موخرالذکر روشنی، اچھائی، خوبصورتی، شان وشوکت، عظمت، فلاح و بہبود، کامیابی، اونچا درجہ، شاہی وقار اور شخصی رتبہ جیسے اوصاف پر مبنی گروہ۔ ان گروہوں سے وابستہ لفظوں کی استعمالی حیثیت کیا رہی ہے، جاننا لازمی ہے جس کا جواب سری اور شری پر ہوئے تحقیقی کام میں مضمر ہوسکتا ہے۔ اس حوالہ سے جو بھی تحریری موادراقم کی نظروں سے گزرا، جہاں سری اور شری کو بطور فعل استعمال ہونے کا حددرجہ فقدان نظر آتا ہے جبکہ صفتی گروہ کے استعمال شدہ لفظوں کی بہت سی مثالیں دستیاب ہوئی ہیں۔ مطلب یہ کہ موخرالذکر رائے میں زیادہ دم خم موجود ہے اور یہی رائے فی الحال معتبر مانی جاتی ہے۔

سری لفظ کا لسانی رشتہ:

ساختی اور معنوی تجزیہ کے بعد سری لفظ کے لسانی اور جغرافیائی رشتے پرسرسری نظر دوڑانے سے عندیہ ملتا ہے کہ سرینگر لفظ کا پہلا مارفیم ''سری'' اور اس کی دوسری صورتیں برصغیر کی بعض لسانی خاندانوں خاص کر آسٹرک دراوڑ اور آریا میں مُروج ہیں۔ جہاں تک ہندوستان میں بولی جانے والی آریائی زبانوں (سنسکرت، ہندی، بنگالی، گُجراتی، پنجابی، اردو) کا تعلق ہے، ''سری'' لفظ کی ساخت، معنویت اور اس کے استعمال میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آرہا ہے۔ بس اتنا سا فرق ضرور ہے کہ کسی

زبان میں سرِی یا سرّی کہیں شرِی یا شرّی استعمال میں رہا ہے اور کبھی کبھار یہ سبھی الفاظ ایک ساتھ استعمال ہوتے آئے ہیں۔

آسٹرک[10]، خاص کر تگالوک[11]، جاونی[12]، کھمر[13]، تھائی[14] وغیرہ زبانوں میں بغیر شرِی کے، سرِی لفظ معمولی ساختی تفاوت کے ساتھ اسم خاص شاہی خطاب اور اعزازی حیثیت کے معنی میں استعمال ہوتا آیا ہے۔ دراوڑ زبانوں تیلگو، ملیالم اور کنّڑ میں سری اور شری الفاظ اُسی ساخت اور معنی ومفہوم میں مروج رہے ہیں جس طرح ان کا استعمال باقی مذکورہ زبانوں میں ہوا ہے۔ لیکن تامل جو دراوڑ لسانی خاندان کی قدیم زبان ہے، کے متعلق اطلاع ہے کہ یہاں سری اور شری لفظ استعمال میں نہیں تھے بلکہ وہ پہلے سے ہی یہ کام ایک تامل لفظ "تھرِو"(Thiru) اور اس کی مزید دو صورتوں تھرِی (Thiri) اور ترِو (Tiru) سے انجام دیتے آئے ہیں۔ بعض لسانی تجزیہ نگار اس بات کے قائل ہیں کہ سری کا اصل ماخذ تامل زبان کا یہی "تھرِو" لفظ ہے جو پورے دراوڑستان خاص کر تامل ناڑو، تلنگانہ، آندھرا پردیش اور کیرلہ وغیرہ میں بالکل عام ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس لفظ کی جڑیں دراوڑ سماج میں کس قدر گہری اور مضبوط ہیں۔ وِنو چلا دُرے لکھتے ہیں:

> "The word Thiri was completely used as an "honorific". It is not only used to address people but also places. Several places names in Tamil Nadu or South India, in general starting with this word like Thiruchandur, Thiruvanamalai, Thiruvanthapuram, Tirupathur etc".15

ان متضاد آرا کے چلتے یہ فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہے کہ سری اور تھرو میں کس لفظ کو اصل اور کس کو مشتق ٹھہرایا جائے۔ کیونکہ دونوں لفظوں کی اِٹمالوجی (Etymology) پر حتمی اتفاق کا فقدان ہے۔ چہ جائیکہ زیرِ بحث لفظوں کی حمایت اور مخالفت میں کافی دلائل دِیئے گئے ہیں۔ محقق، تجزیہ نگار اور نقاد قائل ہیں کہ عقیدتی اور جذباتی وابستگیاں تحقیق و تنقید کی راہیں مسدود کر دیتی ہیں، ساتھ میں حقیقت کی جڑوں کو کمزور بھی کرتی ہیں۔ اِن جیسے عقائد و جذبات نے زیر بحث اصطلاحات کو بھی متاثر کیا ہے۔ تحقیق میں جب بھی اس نوعیت کی پیچیدگی آڑے آئی تو تاریخی لسانیات[16] نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یہاں بھی تاریخی لسانیات کی طرف رجوع کرنا ناگزیر بن گیا ہے۔ زمانہ قدیم سے آج تک حروف، آواز، لہجہ اور لفظوں میں کون سی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں اور کس نوعیت کا ردو قبول ہوا، تاریخی لسانیات کے دائرے میں آتا ہے۔ حروف کی بات کریں تو ''ب''(b) ''پ''(p) میں بدلا ہے[17]۔ ''وٗ''(v) اور ''م''(m) کا آپسی تبادلہ بھی ہوتا آیا ہے۔ نیز ''م'' حروف زیادہ تر ''ب'' اور ''پ'' میں ہی بدلا ہے۔ اسی طرح ''رٗ''(r)، ''ل''(l) اور ''ل''(l) ''رٗ''(r) میں بدلتا رہا۔[18] ان حرفی تبدیلیوں کے باعث ''ڈ''(d)، ''رٗ''(r) اور ''ل''(l) ایک دوسرے میں بدلتے رہے۔ لسانیات کے اس ماحول نے ''ٹ''(t) حروف کو ''س''(s) کی شکل اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ نتیجے میں تِھری(thiri)، تھِرو(thiru) یا ''تِروٗ''(tiru) کے مقابلے میں شِری(shiri) یا شرِو یا سری لفظ معرض وجود میں آ گیا۔ یہ بھی رائے زنی ہوئی ہے کہ دورِ سنگما[19] میں اس نوعیت کا کوئی لفظ س+ر (sr) سے شروع نہیں ہوتا تھا۔ البتہ دراوڑی ادب سے تھ (tha) جیسے لفظ کی شہادت ضرور ملتی ہے۔ زمانہ گُزرا، تھ (t h a) لفظ میں ''رٗ'' (r) کا اضافہ ہوا۔ مدت کے بعد اس کے ساتھ ''وٗ''(v) جُڑ گیا اور ''تھرُوٗ''(tharu) نام کا ایک آزاد مارفیم وجود میں آیا جس

نے آہستہ آہستہ تھرِ واور تھری لفظ کی شکل اختیار کی، تاہم یہ لفظ تا ہنوز سلجھنے کا نام نہیں لیتا ہے۔ پہلے ہی اشارہ دیا گیا کہ یہ مسئلہ عقیدہ اور جذبات کے بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ اس لئے یہ طے ہونا مشکل ہے کہ اصل لفظ سری ہے یا تھری، پر جس کام کے لئے سری/شری اور شری متی رائج ہے، اسی کام کے لئے تھری تھرِ واور تھرومتی جیسے لفظوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً شری لکشمی (دولت کی دیوی)، شریمد بھگوت گیتا، شری لارڈ کرشنا، تھروچند، تھرِ وونتا پورم وغیرہ۔ یہ اعزازی الفاظ دورِ حاضر میں بھی نام سے پہلے استعمال کرنے کی رسم جاری ہے[۲۰]۔

بہر حال سری نگر لفظ کے پہلے مارفیم ''سری'' پر ہوئے تجزیہ سے ظاہر ہے کہ یہ لفظ اکثر و بیشتر قبل از اسم استعمال ہوتا آیا ہے۔ اعزاز اور خطاب کے علاوہ اس لفظ نے احترام اور عقیدے کی جگہ لی ہے اور اِسے صفتی مُقام بھی حاصل ہے۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق کے بعض دروازے ابھی بھی مُقفل ہیں جن کو وا کرانے کے لئے محققوں کا سامنے آنا ضروری ہے۔

نگر لفظ کی صورتیں:

سری کی طرح، نگر کی کئی ساختی صورتیں ہیں جن میں نگرا، ناگرا، ناگر، نگری، ناگری، نگار اور نگارا خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ علم صرف کے مطابق ان سبھی الفاظ کا ماخذ نگر ہے، جن کا وجود اچھر ''ا'' (a) اور ''ی'' (i) ''نگر سے جُڑنے کے بعد ممکن ہوا ہے۔ اگر ان لفظوں سے ''الف'' اور ''ی'' حذف کیا جائے تو صرف نگر (بُنیادی لفظ) کا وجود باقی رہ جاتا ہے۔ جسے رواں بحث میں پرائمری حیثیت حاصل ہے۔ اس بحث کو احسن طریقے پر آگے بڑھانے اور تضاد سے بچنے کے لئے مذکورہ لفظوں کو تین حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے:

ا: نگر، نگرا، ناگر، ناگرا

۲: نگری، ناگری

۳: نگار، نگارا

معنوی اعتبار سے نگر، نگرا، ناگر، اور ناگر الفظوں میں کوئی خاص تفاوت نہیں ہے۔ نگرا اور ناگر لفظ قصبہ شہر اور بستی جبکہ ناگرا اور نگرا قصبہ یا شہر میں جنم لینے اور پرورش پانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ قصبہ اور شہر میں رہنے والے کو نگری اور ناگری کہتے ہیں۔ اس طرح نگار اور نگار الفظ قصبہ یا شہر میں جنم لینے یا بالغ ہونے کو کہا گیا ہے۔ نیز قبیلہ کا نام بھی ٹھہرا ہے۔ بیشتر اہل قلم نے نگری اور ناگری کے سوا باقی تمام لفظوں کے متعلق مجموعی طور اگر چہ مخلوط اظہار رائے کیا ہے[۲۱] لیکن معنوی اور تاریخی پس منظر میں بہرصورت مماثلت پائی جاتی ہے۔

ایک مضبوط نظریہ کے مطابق ''نگرا'' ایک قدیم فرقے کا نام ہے جس کی وابستگی ایک سے زیادہ مذہبی اور لسانی گروہوں سے جوڑ دی گئی ہے۔ بعض اسکالروں نے اُن کا رشتہ ناگ قبائل سے جوڑ دیا ہے اور قدیم آریاؤں سے بھی۔ اِنہیں پراچین کال کے برہمن بھی گردانا گیا ہے جنہوں نے سکندپُران نامی کتاب کے مطابق بُدھ عقائد کے خلاف اور برہمن دھرم کے پرچار میں تحریری اور تبلیغی کام سرانجام دیا ہے[۲۲]۔

سرہربور رِڈلے نے نگرا فرقہ کو دونسلی یعنی ساکا[۲۳] اور دراوڑوں کے ازدواجی تعلقات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر سمیت بعض اسکالروں نے شاید اسی رائے کو بنیاد بنا کر اُنہیں پردیسی گِنا ہے۔ جُوناگڑھ کے مشہور مورخ اور نگرا فرقہ کے جانے پہچانے قلم کار شری شنبھو پرشاد ڈسائی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ نگرا برادری میکڈونیا، شام اور وسطی ایشیا سے آکر برصغیر میں آباد ہوئی تھی۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ سکندراعظم نے جب تین سوق م میں برصغیر پر حملہ کیا تو اُس کے کچھ فوجی کشمیر میں ہی رہنے لگے جنہوں نے مقامی لوگوں سے ازدواجی تعلقات قائم کئے۔

یہاں جو بچے پیدا ہوئے، وہ نگرا یا نگارا کہلائے۔ اسکالروں کا ایک اور طبقہ اس رائے کا بھی حامی ہے کہ نگرا یا نگارا قبائل نے جہاں سے بھی ہجرت کی ہو، وہ سب سے پہلے وارِد کشمیر ہوئے تھے۔ بعدازاں ان کا پھیلاؤ بنگال، مالوہ اور گجرات کے اطراف میں ہوا۔ اسی طرح سرزمین ایران میں نگرا نام کا ایک فرقہ زمانہ قدیم سے بود و باش کرتا آیا ہے جو دانشوری اور نظام منصبی انجام دینے میں ماہر تھا۔ اِنہیں ''مہذب شہر باش'' کے لقب سے بھی نوازا گیا تھا۔ نگر نام کا قبیلہ امریکہ اور کینڈا میں بھی رہتا ہے۔ اِدھر سنسکرت ادب کی سرسری ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے نگر کا اور ناگر کا ایسے دو الفاظ ہیں جن کی ساخت نگر سے مُشابہ ہے۔ نیز معنوی لحاظ سے بھی تقریباً یکساں ہیں۔ مشترکہ طور یہ الفاظ قصبے/شہر کے سربراہ منتظم شہری کے معنی میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔

نگر کی ساخت اور ابتدائی تاریخ:

ماہرین زبان دعویٰ کرتے ہیں کہ نگر (nagar) لفظ میں دو آزاد مارفیم ہیں۔ نگ (nag) اور ار (ar)۔ زبان دان خاص کر سابقوں (perfixes)، لاحقوں (suffixes) اور دراوڑی تاریخ کے محقق بشمول ناقدین قائل ہیں کہ قدیم زمانے میں نگر لفظ کا ار (ar) بطور بستی استعمال ہوتا تھا۔ ڈاکٹر پدمنہ بھیا لکھِنا یا رقم طراز ہیں:

> "The natural open field that facilitated as the human settlement during the early Civilization were possibly designated with the suffix-ar".24

مطلب یہ کہ زمانۂ قدیم میں جو بستیاں وسیع زمین پر بسائی جاتی تھیں، ابتدا میں وہ صرف اَر [ar] سے مشہور ہوئیں۔ دراوڑستان (جنوبی ہند) میں ایسی بہت سی

بستیاں موجود ہیں جن کا لاحقہ ار (ar) ہے۔ مثلاً ٹوڈار (Todar) بولار (Bolar)، کِمار (Kemar) مجار (Mijar)، مُدار (Mudar)، مدار (Madar)، پلار (Palar)، پِلار (Pilar)، اُبار (Ubar) وغیرہ۔ زمانہ گزرتا گیا اور اَر [ar] آہستہ آہستہ آرا (ara) اور آرو (aru) میں بدل گیا۔ یہی بدلاؤ بستی کے ناموں پر بھی راس آیا۔ جسے بنتارا (Bantara)، بولارا (Bolara)، کنتارا (Kantara) وغیرہ جیسے بستی کے نام معرض وجود میں آ گئے[۲۵]۔ اسی طرح کوڈگو، بداگس، تیلگو، کولامی، نائیکی اور ملیالم زبانوں میں ار، اُور، اور، اور وَ لاحقے گاؤں، قصبہ اور شہری بستیوں کی پہچان بن گئے۔ قدیم دراوڑستان[۲۶] سے بھی چند ایسی قدیم بستیوں کے نام بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً نگر (گلگت بلتستان)، نگر (راجھتان)، سَکر (پنجاب پاکستان، نگر (بلوچستان)، سَکر (پونچھ)، الوار (راجستھان)، درگر، اگر، واگر، سلر، داور اور ماور (کشمیر) وغیرہ۔

لسانی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نگر لفظ کا رشتہ دراوڑستان تک ہی محدود نہیں بلکہ مشرق وسطیٰ کے ساتھ بھی اس کی ہزاروں سالہ پرانی قرابت داری رہی ہے۔ مطلب یہ کہ محققین، نقاد، لسانی ماہرین اور خصوصاً لاحقہ شناسوں نے نگر لفظ کے ار (suffix) کا رشتہ مشرق وسطیٰ[۲۷] کی ایک قدیم بستی ''نگر[۲۸]'' سے جوڑ دیا ہے۔ جو میسو پوٹیمیا[۲۹] کے وسیع بالائی علاقے پر پھیلا ایک پُرانا شہر تھا۔ قدیم آثار شناس اور لسانی ماہر ایڈم، نگر نامی شہر کے متعلق لکھتے ہیں:

> "During the third millennium BC, the city was known as "Nagar", which might be of semitic origin and mean a "Cultivated Place".30

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ''ار'' (ar) سامی لسانی خاندان کا لفظ ہے جو

زبانوں کا ایک قدیم گروہ ہے جو پراچین کال میں وسط ایشیا سے نکل کر اُس وقت ملکِ ہند میں داخل ہوا ہوگا جب چار ہزار ق م میں داروڑ اقوام نے شمالی ہند کے اور ہجرت کی تھی، جنہیں وادیٔ سندھ اور موہن جودارو کی تہذیب کا بانی مانا گیا ہے۔ شاید اسی نسبت سے بیشتر اسکالروں نے قدیم سامی [31] اور دراوڑ رشتوں کا خاکہ صفحۂ قرطاس پر یوں رقم کیا ہے:

"According to the most of the scholars, the Dravidian race originated from semetic Civilization. Both are long-headed worship of women and marriage rituals are also similar amongst them. Colonel Holditch holds the opinion that the Dravidians had captured some region of Mesopotamia quite earlier. Later on, they come to India through the route of Makran coast".32

اس اقتباس سے عندیہ ملتا ہے کہ سامی اور دراوڑ اقوام کے درمیان قدیم دور سے اتنے مضبوط رشتے تھے جسے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تہذیبی منبع یکساں تھا یا یہ دونوں ایک ہی ثقافت کے دو رُخ تھے۔ سامی اور دراوڑ کے نسبی، لسانی، سماجی، سیاسی، مذہبی، اقتصادی اور تمدنی رشتوں کو ڈاکٹر سی۔ ایل۔ فیبری، ڈاکٹر ہوٹین، ڈاکٹر ہال، ای میکے، پگارٹ سٹوآرٹ، اے۔ سی دراس وغیرہ جیسے اسکالروں نے بھی کھنگالا ہے۔ ان کے تحقیقی نچوڑ کو ڈاکٹر نول ویوگی نے یوں پیش کیا ہے:

"The above cited examples prove the undisptable relationship among the Crete, Sumerian, Indus Valley civilisation and the

Dravidian races in the Southern India. At the same time it is also confirmed that the real founders of the Indus Valley Civilization were Sumerians (Mediterranean) or Dravidians".33

زیر بحث مقالے کے تذکروں، تجزیوں اور حوالوں میں اس قدر تحقیقی اعتباریت جھلک رہی ہے کہ اس نظریہ سے آنکھیں چُرانا انتہائی مشکل ہے کہ ''نگر'' لفظ کا آپسی ثقافتی رشتہ میسوپوٹیمیا، سُمیر، وادیٔ سندھ اور دراوڑستان کے ساتھ نہیں تھا۔ یقیناً اس مشترکہ تمدُنی ماحول کی صدائے بازگشت برصغیر کے طول وعرض میں آج بھی سُنائی دیتی ہے۔ قدیم قواعدی ماہر پانِنی[۳۴] نے اپنے اوّلین سنسکرت گرامر اشٹ آدھیائی[۳۵] میں دو لفظوں ''نگرا'' اور سُو استوادی[۳۶] جو بنیادی طور پر دو الگ الگ بستی کے نام ہیں، کا تذکرہ کیا ہے[۳۷] ٹالومی[۳۸] کی کتاب ''جغرافیہ'' سے پتہ چلتا ہے کہ ''نگرا'' نام کا ایک قدیم شہر افغانستان میں واقع تھا جو سکندر اعظم کے ہاتھوں تباہ و بُرباد ہوا۔ ہندوستانی پنجاب کے ضلع جالندھر میں ''نگر'' (واقع در تحصیل پھلوِر) نام کی ایک قدیم بستی ہے جو آثار قدیمہ کی نگرانی میں ہے۔ کھدائی کے دوران یہاں مٹی سے بنے سرخ رنگ کے برتن دریافت ہوئے، جن کا تعلق ہڑپا تہذیب سے ہے۔ اسی طرح پنجاب کے نواں شہر، سمرالہ اور تحصیل سنگرو میں ''نگرا'' نام کے کئی دیہات ہیں۔ راجستھان میں نگر، نگرا یا اِن ناموں سے ملتی جُلتی بعض بستیاں آباد ہیں[۳۹]۔

سرینگر کی بُنیاد: مختلف نظریہ

کہا جاتا ہے کہ کشمیر کے مشہور شہر سرینگر کو راجہ اشوک نے ''سرینگری'' نام سے بسایا تھا۔ یہ اشوک کون، کب اور کہاں تھے، اس کے متعلق کئی آرا ہیں۔ تاریخ سے ماخوذ ہے کہ برصغیر میں اشوک نام کے کئی راجہ گزرے ہیں جنہوں نے الگ الگ

وقتوں اور علاقوں میں حکومت کی تھی۔ ایک اشوک جن کی بہت کم تفصیلات دستیاب ہے، پانچ سوق م میں مگدھ کے حکمران ہوئے۔ان کے سکّوں پراُن کا ذاتی نشان کُھدا ہوا تھا۔تقریباً سوا دوسو سال بعد مگدھ سے ایک اور اشوک اُٹھے، جن کی تخت نشینی 268 ق م کے آس پاس ہوئی تھی۔اس راجہ کے سکّوں پر ویسے ہی نشان کندہ تھے جیسے اشوک اوّل کے نشانات تھے۔موخرّ الذکر اشوک کے سکّے ،اشوکِ دوم کے زمانے اوراس کے بعد بھی جاری تھے۔اوّل الذّکر اشوک کو مورخین نے ''کالا اشوک'' نام دیا ہے جبکہ دوسرے اشوک اپنے آپ کو''پیادسی''یعنی حسین اشوک کہلوانا پسند کرتے تھے[۴۰]۔ تیسرے اشوک کا تعلق کشمیر سے تھا۔بعض اسکالروں کے غور وخوض اور چھان بین کے بعد اس کا دورِ حکومت تین سوق م کے آس پاس ٹھہرا ہے جس سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ موخرّ الذکر دو اشوکوں کے بیچ کوئی پچاس برس کا وقفہ تھا۔اگر پچاس سال کا خلا درست مان کر چلیں تو تاریخ میں وقت کی یہ مختصر فاصلہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

رہی بات''سرینگری''کو بسانے اوراس کے جائے وقوع کی تو اس حوالے سے مورخ ملک حیدر چاڈورہ اور محمد اعظم دیدمری لکھتے ہیں کہ''سرنگری''کو اننت ناگ کے علاقے''سیر''[۴۱]جو تب کے پرگنہ کھوؤرپورہ میں دریالیدر کے بائیں کنارے واقع ہے، آباد کیا تھا[۴۲]۔ جارج بُہلر کا کہنا کہ اُسے چند کشمیری پنڈتوں نے گوش گزار کیا کہ سرینگری اننت ناگ کے اطراف میں ہی واقع تھی[۴۳]۔نیز پروفیسر ولسن بھی اسی قسم کی رائے پرگامزن تھے۔تاہم راج ترنگنی کے مطابق جب راجہ پرورسین دوم نے پرور پورہ شہر کی بنیاد ڈالی تو اُس نے پرانے دارالخلافہ، جس کی شناخت البیرونی اور جارج کننگھم نے پُرانڈستھان (موجودہ پاندریٹھن) کے طور کی ہے، کے نزدیک ہی اس نئے شہر کی بُنیاد رکھی تھی[۴۴]۔اس میں اختلاف نہیں کہ سرینگری کی اصل جائے وقوع کے متعلق بیشتر ناقدین اور مورخین نے راج ترنگنی کے بیان پر ہی بھروسہ جتا کر اکتفا کیا کہ سرنگری

اطراف اننت ناگ میں نہیں بلکہ دورِ حاضر کے سرینگر میں ہی بنائی گئی تھی۔

جہاں تک سرینگر کو بسانے والے کا تعلق ہے، اس کے متعلق رائے زنی کی گئی ہے کہ اس شہر کو اشوک نام کے راجہ نے بسایا تھا۔ یہ اشوک کس علاقے کا باسی تھا، اس کے متعلق پنڈت کلہن رقم طراز ہیں:

> "The illustrious king built the town of Srinagari which was important on account of its ninety six lakhs of housed respondent with wealth".45

اس اقتباس اور تاریخ ہٰذا کے سیاق وسباق سے واضح ہے کہ سرینگر کو مشہور اشوک نے آباد کیا تھا۔ ایم۔اے سٹائن، جارج بہُلر اور جنرل کننگھم سمیت بعض قلم کاروں نے کلہن کے اس اقتباس سے یہ مطلب نکالا کہ سرینگر پاٹلی پترا والے اشوک نے بنایا تھا۔ اِن محققوں نے یہ دعویٰ کس بنیاد پر کیا ہے، اس کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ جب دو اشوکوں کے نسبی یا خاندانی شجرے کا تحقیقی جائزہ لیا جاتا ہے تو کسی بھی زاویہ سے ان میں مماثلت کی کوئی بھنک نہیں آتی ہے۔ پاٹلی پترّا اشوک کے باپ کا نام بندوسار ولد چندر گپت تھا، جو موریہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان کی بُنیاد 321 ق م میں چندر گپت اوّل نے ڈالی تھی۔ نیز مورخین نے اس راجہ کو اشوک اعظم کے لقب سے مشہور کیا۔ جبکہ کشمیری اشوک کے باپ کا نام تا ایں دم پردۂ اخفا میں ہے۔ بقول کلہن کشمیر کا اشوک سچی نر کا چچا زاد بھائی اور شکونی کا پڑپوتا تھا۔ واقعات کشمیر میں اشوک سچی نر کا بھتیجا ٹھہرا ہے اور تاریخ حسن نے اُسے سچی نر کی اولاد میں شمار کیا ہے[۴۶]۔ جبکہ محمد دین فوقؔ نے اشوک کا رشتہ راجہ گودھر کے پوتے اور راجہ جنک کے بھائی سنگنی (جو راج ترنگنی کے سکّونی سے ملتا جلتا ہے) کی اولاد سے جوڑ دیا ہے[۴۷]۔

ان اختلافات کے متعلق واقعات کشمیر کے ترتیب، تدوین اور مترجم پروفیسر شمس الدین احمد نے یوں خامہ فرسائی کی ہے:

''ان معمولی اختلافات سے قطع نظر گویا راجہ اشوکِ کشمیر اور راجہ اشوکِ ہندوستانی کا دوالگ الگ ہونا اور روشن ہو جاتا ہے[۴۸]۔

کشمیر اشوک کے ذادوبوم سے متعلق عدم تفصیل کی سب سے بڑی وجہ یہ کہ راج ترنگنی میں بادشاہت کی بہت سی کڑیاں غائب ہیں جن کے متعلق مذکورہ تاریخ کے مؤلف کو شاید کوئی علمیت نہ تھی۔ تاریخ کا یہ عظیم واقعہ مختصر نہیں بلکہ باون بادشاہوں کی حکمرانی پر مُشتمل ہے جس میں اشوک کے اسلاف بھی شامل تھے۔ کلہن سے تقریباً آٹھ سو سال کے بعد مورخ حسنؔ اور محمد الدین فوقؔ کی علمیت میں تاریخ رتنا کر کا ایک مسودہ آیا جو کلہن سے تین سو سال پہلے ضبطِ تحریر میں آیا تھا۔

حسنؔ شاہ کھویہامی اور محمد الدین فوقؔ نے بازیافتہ باون بادشاہوں کی مدتِ حکمرانی تین سو تریسٹھ سال قرار دی ہے۔ یہ اعداد و شُمار ''تاریخ رتنا کر'' میں درج ہیں یا مذکور مورخین نے از خود مقرر کئے ہیں، یہ کہنا مُشکل ہے۔ متذکرین نے گُم گشتہ بادشاہوں کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ اُنہوں نے باون راجے ''تاریخ رتنا کر'' سے نقل کئے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ مذکورہ تاریخ کے نسخہ کا آج تک کوئی اتہ پتہ نہیں ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ دو اشوکوں کے جانشینوں میں کوئی یکسانیت نہیں ہے۔ پاٹلی پتّرا کے اشوک کا جانشین اِس کے بیٹے کا بیٹا دشرتھ تھا جبکہ اشوکِ کشمیر کا اکلوتا بیٹا جلوک، باپ کے مرنے کے بعد تخت پر بیٹھا جسے دو الگ الگ اشوکوں کی شناخت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح کلہن کے بقول کشمیری اشوک نے شش کلیتر[۴۹] اور وتشتاتر[۵۰] نام کی بستیوں میں ستوپے تعمیر کئے۔ وجبیشورہ[۵۱] میں ایک پرانے مندر کو گرا کر[۵۲] اس

کے ساتھ والے احاطے میں اشوک شور نام کے دومندر بنوائے۔ اس کے برعکس، پاٹلی پتّر اشوک کے متعلق مُبالغہ ہے کہ اُس نے چُراسی ہزار ستوپا تعمیر کئے اور ایک درجن سے زیادہ ستوپوں پر اپنے فرمان لکھوائے ہیں۔ پاٹلی پتّر شہر کے گرد بنی دیوار کی مرمت کی، دیوار میں ۵۷۰ ستون نصب کئے اور شہر میں داخل ہونے کے لئے ۶۴ دروازے بھی بنوائے۔ مطلب یہ کہ تعمیری کاموں میں بھی فرق نمایاں ہے۔ پاٹلی پتّر اشوک نے خوں ریز لڑایاں لڑی ہیں۔ کالنگا (موجودہ اڑیسہ) پر جنگ مسلط کر کے اپنے سوتیلے بھائیوں سمیت تقریباً دو لاکھ لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ پٹنہ (پاٹلی پتّر) میں قیدیوں کی اذیت رسانی اور قتل کرنے کے لئے ایک ''دوزخِ ارضی'' بنائی۔ جہاں بعد کے ایام میں سیاحوں کو سیر کرائی جاتی تھی[۵۳]۔ اشوک کی اس ''دوزخِ ارضی'' کے متعلق جب چینی سیاح ''فاہیان'' پانچویں صدی کے دوران پاٹلی پتّر پہنچے تو انہیں ''جہنم اشوک'' کے بارے میں بہت کچھ سُننے کو ملا اور مُشاہدے میں آیا، لکھتے ہیں:

"Outside the city of Pataliputra he had seen certain fortified wall which was called the boundary of hell built on Ashokas orders ".54

اسی طرح ہیون سانگ کا کہنا ہے کہ اُس نے ساتویں صدی میں پاٹلی پتّر کی سیاحت کے دوران ''دوزخِ ارضی'' یا ''جہنم اشوک'' کے ستون از خود دیکھے تھے[۵۵]۔ ڈیوڈ برنیئر کے بقول ''ٹارچر چیمبر'' میں داخل ہوتے ہی ایک عبارت ''راجہ اشوک نے ایک جہنم بنایا'' پر نظر پڑتی ہے[۵۶]۔ اس کی بجائے کشمیری اشوک کے بارے میں جو تحریریں دستیاب ہیں، اُن سے یہی اخذ ہوتا ہے کہ وہ عابد، شریف، رعایا پرور، پرہیز گار اور امن پسند راجہ تھا جس کی سب سے اہم مثال اُس وقت دیکھنے کو ملتی ہے جب ملیچھ ملک کشمیر کو بربادی کی طرف لے جانے میں مصروف تھے تو کشمیری اشوک

نے بُدشیر پہاڑ کی تلہٹی میں نرائن ناگ کے چشمہ پر بوٹی شور مندر بنوایا اور ترک دُنیا ہوکر باقی عمر یہیں عبادت میں گُزاری [57]۔ متذکرہ بالا بحث سے واضح ہے کہ پاٹلی پُتّر اشوک نے بہت سے مذہبی تعمیراتی کام پایۂ تکمیل تک پہنچائے تھے۔ لیکن کسی بھی تاریخ میں ایسا کوئی عندیہ نہیں ملتا ہے کہ اس راجہ نے کوئی گاؤں، قصبہ یا شہر بسایا ہو۔ اگر ہندوستانی مورخین اور تاریخ شناشوں کو معمولی اشارہ بھی دستیاب ہوا ہوتا، تو اُنہوں نے اس کی خوب تشہیر کی ہوتی۔ پھر بھی بعض جدید اور نوآموز مورخین سرینگر اور موریہ اشوک کے بے بنیاد رِشتوں کو ہوا دے رہے ہیں۔ حقیقت میں مذکورہ آرا کے متعلق قدیم تاریخ خاص کر مہاوسہ، دِویاودانا، دِپاومسہ، اشوکاوِدانا اور اشوک کے کتبوں میں ایسا کوئی تذکرہ یا اشارہ نہیں ملتا ہے ورنہ ہزاروں ستوپے درج کرنے سے پہلے ہندوستانی مورخین نے شہر کے بانی کو اوّلین ترجیح دی ہوتی۔

راج ترنگنی کے ایک سو سے ایک سو چار تک کے شعروں میں ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن سے پاٹلی پُتّر اشوک کا مفہوم ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں ''گناہوں سے پاک، جین کا معتقد اور مشہور راجہ اشوک جیسے الفاظ قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً:

"This king who freed himself from sins
and had embarassed the doctrine of Jina".58

ان لفظوں سے مورخوں اور تاریخ شناسوں کو موریہ اشوک کی بُو آنا، تحقیقی اعتبار سے بالکل غلط ہے جس کی دو وجوہات ہیں۔ اوّل یہ کہ کالنگا جنگ میں لاکھوں لوگوں کو قتل کرنے کے بعد موریہ اشوک کا نام ہونا اور بُدھ مت قبول کرنا، بعض مورخین اور کتبوں کے مطابق درست نہیں ہے۔ دلیل دی جارہی ہے کہ اشوک نے کالنگا جنگ سے کئی سال پہلے بُدھ مت قبول کیا تھا۔ بھنڈارِکر رقم طراز ہیں:

> "What Asoka tells us in edict [XIII], not at all the atrocities of the war made him grave and contrite and turned his mind to Buddhism. But clearly that he was already Buddhist and therefore eshamed of the war and fell deep to longing for Dhamma at the time when the edict was proclaimed".59

قدیم نوشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ موریہ اشوک انتہائی حد تک بُدھ مت کا پرستار تھا۔ ''دِویاودانا'' کے مطابق پنڈا ورومانا نامی شہر میں ایک غیر بُدھ نے ایسی تصویر بنائی تھی جس میں مہاتما بُدھ کو مہاویر کے قدموں پر جھکتے دکھایا گیا تھا۔ کسی عقیدت مند نے اشوک سے اس کی شکایت کی جس نے تصویر بنانے والے کو گرفتار کرانے کے بعد قتل کروایا۔ اس کے فوراً بعد اشوک نے مذکورہ بستی کے اجیوکا عقیدہ (جین عقیدہ)[60] سے وابستہ کئی لوگوں کو پھانسی پر چڑھایا۔ اسی طرح پاٹلی پُتر میں بُدھ کی تصویر بنانے کی پاداش میں ایک سنیاسی اور اُس کے پورے خاندان کو زندہ جلایا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اشوک نے ہر اُس شخص کو چاندی کا سکّہ انعام دینے کا اعلان کر رکھا تھا جو جین فرقہ سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کو گرفتار کروانے میں مدد کرے گا۔ اس حکم کے نتیجے میں اشوک کے ایک اپنے بھائی ویتاشوکا کو بدعتی سمجھ کر کسی چرواہے نے مار ڈالا[61]۔

کئی نوشتوں میں اشوک کے مظالم کا زبردست چرچا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بُدھ مت قبول کرنے سے پہلے وہ زبردست ظالم اشوک کے نام سے مشہور تھا[62]۔ درج ہے کہ اُس نے اپنے قریبی رازدار سراغ رسانوں کو حکم دیا تھا کہ ''ایک فاسق آدمی کو تلاش کر کے لاؤ جو بطور سرکاری جلاد کام کرے گا''[63] ڈھونڈنے کے بعد ''گریکا'' نام کا آدمی ملا، جس نے اپنے والدین کو مار ڈالا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے

کہ ان کا بیٹا اشوک کا جلاد بنے۔ جب ''گریکا'' کا تعارف اشوک سے کرایا گیا تو اُس نے فوراً اُسے اپنی سلطنت کا سرکاری جلاد مقرر کیا[۶۴]۔ مشہور ہے کہ دورِ اشوک میں قیدیوں کا منہ لوہے سے کھول کر ان کے حلق میں تانبے کی دہکتی سلاخ ڈالی جاتی تھی جس سے ان کی ایذا رسانی کی شدّت محسوس کی جاسکتی ہے[۶۵]۔ بعض محققین دعویٰ کرتے ہیں کہ موریہ اشوک بظاہر بُدھ مت کا پیروکار تو لگ رہا تھا، لیکن اُس کی حرکات بُدھ اصولوں سے میل نہیں کھاتی تھی بلکہ وہ اُن سے کوسوں دُور تھا[۶۶]۔ لیکن اس بات سے بھی مفر نہیں کہ کبھی کبھار اصل واقعات پر ایسی دبیز گرد پڑتی ہے کہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ منسوبات میں کس نظریہ پر بھروسہ کیا جائے۔ تحقیق کی رو سے سب نظریات پیش کرنے کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ ممکن ہے۔

مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مورخوں، ترجمہ کاروں اور تجزیہ نگاروں نے راج ترنگنی میں درج لفظوں کے سیاق وسباق کی طرف یا تو غیر ارادی طور توجہ نہیں دی ہے یا جین مت اور بدھ مت کو ایک سمجھ کر سہل انگاری برتی ہے۔ ایسا نتیجہ اخذ کرنا جین مت اور بُدھ مت کی مذہبی کتابوں سے ہرگز میل نہیں کھاتا اور نہ ہی لغت کے اعتبار سے ان میں یگانیت پائی جاتی ہے[۶۷]۔ چہ جائیکہ بعض عقائد میں یکسانیت تو ہے لیکن بنیادی اصول تو الگ الگ ہیں۔ مثال کے طور بُدھ مت تصوّرِ خدا کے متعلق خاموش ہے جبکہ جین مت میں خدا کا تصوّر ہی نہیں ہے۔ اُن کے یہاں تمام اجزا اور افعال فطری قوانین کے تحت چلتے ہیں۔ جین مت میں اہنسا پر سختی سے عمل کرنے کی تلقین ہے جبکہ بُدھ میں میں نرمی برتی جاتی ہے۔ بُدھ مت میں گوشت کھانے کی اجازت ہے لیکن جین مت میں اس کی زبردست اور سخت ممانعت ہے۔ ایک اور بات یہ کہ اگر بعض اسکالروں کے مطابق جین مت اور بُدھ مت میں کوئی تفاوت نہیں تو پاٹلی پُتر اشوک جین مت کے پیروکاروں کو کیوں موت کے گھاٹ اتارتا تھا[۶۸]۔ اس لئے

راج ترنگنی میں درج کشمیری اشوک کو موریہ اشوک قرار دینا درست نہیں ہے۔ راج ترنگنی کے مطابق کشمیری اشوک جین عقیدے سے تعلق رکھتا تھا۔ جبکہ مہاومسہ وغیرہ کتابوں کے مطابق موریہ اشوک کی وابستگی بُدھ عقیدہ سے تھی۔ کشمیری اشوک کے جین عقیدے سے مُنسلک ہونے کے متعلق فارسی مورخ ابوالفضل نے آئین اکبری میں یوں خامہ فرسائی کی ہے:

''و چوں فرماندھی بہ اشوک، پسرِ عمّ راجہ جنک باز کردید، کیشِ برھمن انداختہ، آئین جبین برگرفت''[۶۹]۔

ترجمہ: اور جب راجہ جنک کے بھتیجے اشوک کو حکومت واپس ملی، اُس نے برہمن عقائد کو چھوڑ دیا اور جین مذہب کو اپنایا۔

مندرجہ بالا بحث سے جو نتیجہ سامنے آیا ہے، اس سے بھی ثابت ہوا ہے کہ اشوکِ کشمیر اور پاٹلی پُتّر اشوک دو الگ الگ راجہ تھے۔ ان حقائق کو بھانپتے اور جانتے ہوئے بعض تاریخ شناش اور تاریخ کے ناقدین نے واضح کیا ہے کہ راج ترنگنی کے ترجمہ کار آر۔ ایل۔ سٹائن سمیت جن اسکالروں نے گونند خاندان کے کشمیری اشوک کو موریہ اشوک کے طور نشاندھی کی ہے، قطعی طور غلط ہے[۷۰]۔ آنند۔ ڈبلیو۔ بی۔ گروگ کے بقول ہندوستانی اسکالروں نے کلہن کی راج ترنگنی میں درج اشوک نامی بادشاہ کے متعلق غیر ضروری طور اپنی منشا کے مطابق بیان کی طرف زیادہ توجہ مرکوز کر کے غلط نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ان کا دعویٰ کہ راج ترنگنی میں جس اشوک کا تذکرہ ہے، وہ بلاشُبہ مگدھ یا موریہ خاندان کا اشوک نہیں بلکہ کشمیر کا راجہ تھا[۷۱]۔ موریہ اشوک ''بھاروکتبہ'' میں از خود اقرار کرتا ہے کہ وہ مگدہ کا راجہ تھا[۷۲]۔

بہر حال بات چل رہی تھی سرینگر کو بسانے والے اشوک کی۔ مندرجہ بحث سے کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے کہ سرینگری یا سرینگر کا بانی پاٹلی پُتّر کا اشوک تھا بلکہ

واضح ہوا ہے کہ اگر سرینگر کسی اشوک نے بسایا ہے تو وہ کشمیری اشوک ہی ہوسکتا ہے۔ اس بات کو جانچتے ہوئے آنند گروگ نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ راج ترنگنی میں موریہ اشوک کا تذکرہ تلاش کرنا قابل بھروسہ نہیں ہے۔ کیونکہ:

> "....the least helpful are the Puranas, while Kalhana's Rajtaragini can hardly be a historical source for Ashoka, the Mauryan Emperor".73

مطلب یہ کہ موریہ اشوک کو جس زاویہ سے بھی دیکھا جائے، لاکھ کوشش کے باوجود بھی کشمیر سے کوئی رشتہ ثابت کرنا انتہائی مُشکل ہے۔ ساتھ میں یہ دعویٰ کہ اشوک نے ''سرینگری'' میں ۹۶ لاکھ مکانات تعمیر کئے تھے، ایک اور مبالغہ آمیز بیان ہے جو حقیقت کی سرحدوں سے بہت دور ہے۔ اِدھر جنرل کننگھم نے ''سرینگری'' کا محل وقوع پاندریتھن قرار دیا ہے جس پر بھروسہ کرنے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا ہے۔ اس چھوٹی سی جگہ میں لاکھوں مکانات موجود ہونا سرینگری کے جغرافیائی حدود پر سوالیہ نشان ثبت کرتا ہے۔ ذرا غور کیجئے اور دیکھئے، پاندریتھن کا محل وقوع اور اس کی تنگ دامنی۔ ایک طرف ویتھ یا قدیم ویتستا بلکہ موجودہ جہلم اور دوسری طرف پہاڑ۔ اس قلیل رقبہ پر ''سرینگری''، اس کے بازار، سڑکیں اور چھیانوے لاکھ مکان تعمیر کرنا، جغرافیائی اعتبار سے مبالغہ آمیز ہے ہی، لیکن یہ بیان بعید از عقل بھی ہے۔ اس مبالغہ آمیزی کو دور کرنے کے دو طریقے ہوسکتے ہیں۔ اوّل کلہن کا ماخذ کھوجنا جہاں سے اُس نے ''لاکھوں مکانات'' کا مرکب لفظ نقل کیا ہے[۷۴]۔ دوسرا یہ کہ اسے پروف ریڈنگ کی غلطی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اشوکِ کشمیر اور اشوک پاٹلی پُتّر کے حسب و نسب اور

کارہائے حکمرانی کے تقابلی اور تنقیدی جائزے اور اخذ شدہ نتیجہ پر کشمیری شاعر پروفیسر رحمٰن راہیؔ کا یہ مصرعہ بالکل صادق آتا ہے۔

دِمہٕ کتھ بہٕ واٹھ وٹم ،چُھنہٕ چون کانْہہ طرح سیوٚد

(ترجمہ: میں کیا کیا جوڑ دوں، جب بشمول بنیاد آپ کی کوئی بھی اکائی اور خاکہ درست نہیں ہے"۔)

بہرحال جب بنیادی نظریہ کے پاؤں ڈگمگاتے ہوں تو سفر ارتقا میں راستہ بھٹک جانے کا خدشہ رہتا ہے۔اس بحث سے بھی عندیہ ملتا ہے کہ''سرینگری'' کو پاٹلی پتّر والے اشوک نے نہیں بلکہ کشمیر کے اشوک نے ہی آباد کیا ہوگا۔زیر بحث مقالے سے منسلک پنڈت کلہن کی یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اُس نے سرینگر کے بجائے سرینگری لفظ کو کیونکر درج کیا ہے، چہ جائیکہ بیشتر قدیم بستی نام غیر متحرک ہوا کرتے تھے۔یہ بھی سچ ہے کہ لسانی خاندانوں اور ان سے وابستہ زبانوں کو اِرتقائی سفر کے دوران قطع و برید کے کئی تاریخی مرحلوں اور ادوار سے گُزرنا پڑتا ہے جس سے لفظوں میں ساختی اور لاحقہ کی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔عین ممکن ہے کہ اسی لسانی کانٹ چھانٹ اور لاحقہ یا حروف کے اضافی ماحول نے نگر لفظ کو بھی نگری میں بدل دیا ہو جو پراکرتی اصولوں کے عین مطابق ہے جس کی تصدیق منوسمرتی (شلوک۔40213) سمیت پرانوں، رزمیہ داستانوں، دھرم شاستروں، تاریخ، جغرافیہ، خطاطی ناموں اور پراکرت زبانوں سے بھی ہوتی ہے[۵۷]۔

علمِ سکّہ:

زیرِ بحث مقالے سے مُنسلک ایک اور رائے اُس وقت سامنے آئی جب محکمہ آرکیالوجی کے سرینگر سرکل نے 1983-1981ء میں سیمتھن (بجبہاڑہ۔اننت ناگ) میں کھدائی کے دوران چند سکّے دریافت ہونے کا انکشاف کیا تھا جن سے آثارِ قدیمہ کے ماہر جی۔ایس۔گورکومور یہ حکمرانوں کے پنچ مارک سکّوں کا

شائبہ ہوا تھا۔ جی۔ایس گور کے اس اِنکشاف کا اچھا خاصا چرچہ کیا گیا۔لیکن بحث کی راہیں مسدود رہنے کی وجہ سے چرچہ غیر موثر رہا۔شاید اس لئے کہ تذکرہ نویسوں نے اس دعویٰ کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اگر ایسا ہی ہوا ہو تو اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اِن سکّوں کی سرِ عام نمائش نہیں کی گئی اور نہ ہی اسکالروں کو اُن کے بارے میں تا ایں دم کوئی جانکاری ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ان سکّوں پر کس نوعیت کے کتنے پنچ کُندہ ہیں۔ دوسرا یہ کہ گور نے اپنے ایک نوشتہ میں مذکورہ سکّوں کا جو عکس پیش کیا ہے، اس کے متعلق بھی کوئی وضاحت نہیں کی ہے جس سے سِکّوں کا وضاحتی پہلو مکمل طور پردۂ خفا میں رہا۔

جہاں تک پنچ مارک سکّوں کی تاریخ کا سوال ہے، اس میں قطع و برید کے سوا موریہ حکمرانوں کا کوئی رول نہیں رہا ہے۔ اس قسم کے سکّے موریہ خاندان سے بہت پہلے لیڈیا[76] حکمرانوں کے یہاں مروج تھے[77]۔ چھٹی صدی ق م کے آغاز میں ایران کے ہخامنشی خاندان کے شہنشاہِ کورش بزرگ جسے سائرس اعظم بھی کہا جاتا تھا، نے مُلک لیڈیا پر فوج کشی کی اور وہاں کے بادشاہ کروسیس کو 546 ق م میں شکست دے کر لیڈیا کو ایرانی سلطنت کا صوبہ بنایا۔ یہی وہ ملک ہے جہاں پنچ مارک سکّے مروج تھے جن پر شیر اور بیل کا پنچ کندہ تھا۔ 510 ق م کے آس پاس ہخامنشی خاندان کے داریوش اوّل نے برصغیر کے شمال میں واقع گاندھارا ریاست پر قبضہ کیا۔ داریوش نے شیر اور بیل کے بدلے سکّوں پر ایران کے بادشاہ کا عکس بطور پنچ مارک استعمال کیا[78]۔ ازاں بعد داریوش (دارا) دوم نے سندھ، ارچوسیا، مکران اور کشمیر کے شمال مغربی علاقے اپنے دائرہ اختیار میں لائے جو گندھارا، ریاست کے نام سے مشہور ہوئے[79]۔ بعض مورخین کا دعویٰ ہے کہ صوبہ کا اصل نام ''کشمیر گندھارا'' تھا[80]۔ نیز ہروڈٹس[81]، رائے چوہدری[82]، بامزے[83] وغیرہ نے بھی کشمیر گندھارا اور ہخامنشی

حکمرانوں کے آپسی رشتوں اور نزدیکیوں کا تذکرہ کیا ہے جس سے عندیہ ملتا ہے کہ کشمیر میں پنچ مارک سکّے اُسی زمانے سے مُروج ہوئے ہوں گے جب کشمیر ہخا منشیوں کے دائرہ اختیار میں آیا ہو۔ پھر بھی کوئی حتمی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہوگا، جب تک سیمتھن سے برآمد ہوئے سکّوں پر کندہ پنچوں کے متعلق مُفصل رپورٹ سامنے نہیں آجاتی۔قارئین کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ اگر مذکورہ سکّوں کے بارے میں کبھی کوئی وضاحت سامنے لائی گئی ،جس سے ثابت ہو کہ یہ سکّے موریہ خاندان کے راجہ اشوک کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں،تو بھی یہ مستند شہادت کے دائرہ میں نہیں آسکتی ہے۔ کیونکہ چند سکّوں کو بُنیاد بنا کر تاریخی سنّد فراہم کرانے کا طریقہ تحقیق اور تحقیقی اصولوں کے بالکل منافی ہے۔جواز یت یہ کہ سکّوں کا جغرافیائی پھیلاؤ اکثر سیاسی فتح کے تابع رہا ہے۔بعض اوقات یہ سکّے سیاسی سرحدوں سے بہت آگے نکل جاتے ہیں جس میں تجارت، سیاحت اور لوٹ مار کا خاصا عمل دخل رہ چُکا ہے۔تاہم اگر صرف چند سکّوں کی دریافت کو وسعتِ سیاسی حدود، تجارت یا لوٹ سے جوڑا جائے تو منفی نتائج نکلنا طے ہے۔اس لئے کھدائی سے دریافت شدہ چند سکّوں کو کسی طے شدہ سیاسی جغرافیہ کی بجائے ٹراول کوئینز (Travel coins) کے کھاتے میں ڈالنے کی روایت درست مانی جاتی ہے جس کی اپنی الگ تمدنی افادیت ہے۔

سرینگر نام: ایک اور کروٹ

بہر حال مذکورہ صفحات میں مقالہ کے متعلق ہوئی بحث سے مجموعی طور یہ تصور اُبھر کر سامنے آیا کہ اگر اشوک نام کے کسی راجہ نے سرینگر کو بسایا ہو تو نظریں بہر زاویہ اور بہر صورت گوننده خاندان کے کشمیری اشوک کی طرف اُٹھتی ہیں۔تاہم یہاں ایک اہم سوال ذہن پر سوار ہوتا ہے کہ اشوک کے پیش روؤں نے ایسا تمدن پروان چڑھایا تھا، جس کے چلتے راجہ، رانی یا خاص وزیر اپنے نام پر ہی کوئی بستی آباد

کرتے تھے۔مثال کے طور راجہ پرتاب شیل کا پرتاب نگر[۸۴] اور راجہ لاک چند کا لارک نگر[۸۵]۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر سرینگر کو اشوک نے آباد کیا ہوتا تو ممکنہ حد تک مذکورہ بستی لازمی طور اسی کے نام سے منسوب ومشہور ہوتی۔لیکن ایسا نہیں ہے جس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔سب سے اہم وجہ شاید یہ ہے کہ سرینگر کو اشوک نے آباد نہیں کیا ہے، تو اس کے ساتھ اپنا نام منسلک کرنے کا کیا جواز تھا۔ممکن ہے کہ اگر اشوک نے سرینگر کی بُنیاد ڈالی ہوتی تو یہ ضرور ''اشوک نگر'' کہلاتا۔ جب اشوک نے وجیشورہ یعنی بجبہاڑہ (اننت ناگ) میں ایک پُرانا مندر گرا کر اس کے احاطے میں اپنے نام پر اشوک شور کے دو مندر تعمیر کئے تو ایک شہر کو آباد کر کے اپنے نام سے کیوں نہیں منسوب کرتے۔لیکن پھر بھی اشوک اور سرینگر کے ملاپ کا تضاد یوں ہی نہیں ہوسکتا۔ان دو مشہور ناموں کی قرابت داری کے پس پردہ ضرور کوئی ان کہی کہانی ہوسکتی ہے جس کی نقاب کشائی شاید ابھی باقی ہے۔

ممکن ہے کہ اشوک نے کوئی بستی بسائی ہو جسے سرینگر نام سے مماثلت ہو۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے جس کی طرف راقم نے پہلے ہی اشارہ کیا ہے کہ اشوک نے اننت ناگ کے اطراف میں دریائے لیدر کے بائیں کنارے پر واقع کھوور پور میں ''سیر'' نام کا شہر بسایا تھا جسے بعض مورخین نے اشوک کا آباد کردہ سرینگر مطلب نکالا ہے۔فارسی مورخ ملک حیدر چاڈورہ لکھتے ہیں:

> ''بعد ازاں راجہ اشوک برادرزادہ او (راجہ سچی نر) بحکومت رسید۔او شہر ''سیر'' را درسمت مراج چناں معمور نمود کہ شش لک خانہ متمول درآں شہر آباد ساخت''[۸۶]۔

ملک حیدر چاڈورہ کے علاوہ اور بھی مورخین اور محققین نے ''سیر'' کو سرینگر ٹھہرایا[۸۷]۔ زمانے کے مذہبی، لسانی اور سیاسی انقلابوں نے تمدن سمیت ''سیر''

اور''سری''(نگر) کی تاریخی اہمیت کو کئی بار تہہ و بالا کر دیا۔ نیز وقتاً فوقتاً تبدیلی مذہب، لسانی یلغار اور سیاسی آندھیوں نے کشمیر کی قدیم ثقافت کو انتہائی حد تک مسخ کیا بلکہ صفحہ ہستی سے بھی مٹایا۔ لہٰذا''سیر''، سری اور نگر کا خلط ملط ہونا کسی بھی صورت میں ناممکن نہیں تھا۔ مذکورہ موضوع کے حوالے سے سینہ بہ سینہ کیا کُچھ چلتا رہا اور پھر ہزار سال گزرنے کے بعد لوگوں کی یاداشت سے مورخین نے اپنے نظریہ کے مطابق جو کچھ ضبط تحریر میں لایا، اُس پر بہر حال فوک لور کی ہی چھاپ ہے۔ اسلئے احمد کی ٹوپی محمود کے سر کے امکان کو خارج نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مگر جب تحقیقی اصولوں کو بروئے کار لا کر فراموش شدہ یا مسخ شُدہ تاریخی راہوں سے گھٹا دور ہو جاتی ہے تو ارتقائے تحقیق میں کروٹ پر کروٹ لینا طریقہ کار کا تقاضا ہے۔ یہی طریقۂ کار، تحقیق کے تہہ خانوں کو کھنگال کر بنیادی زینہ کا سراغ لگاتا ہے۔ ممکن ہے اسی طریقۂ تحقیق سے سرینگر نام کی بنیادی تاریخ کے دریچے بھی وا ہو سکتے ہیں۔

لسانی اعتبار سے دیکھا جائے تو سری نگر نام میں شامل حروف، صوت اور لہجہ ہئیت کی سلوٹوں کو کھنگالنے اور ان کی گراہوں کو کھولنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ کا بُنیادی سوتا ناگ قوم کے ابتدائی تمدن سے جُڑا ہے۔ یہ بات کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ ناگ قوم پہلے پہل ستی سر کے کوہستانی زمینوں پر بود باش کرتی تھی جس کی صدائے بازگشت ناگ سر، ناگ مرگ، ناگ پتھر، کوثر ناگ، شیش ناگ، ناگ بیرن وغیرہ ناموں میں سُنائی دیتی ہے۔ تاریخی ماہرین، زبان دان اور آثار شناس دعویٰ کرتے ہیں کہ برصغیر میں ناگ قوم نے نہ صرف بستیاں بسائی تھیں بلکہ بعض حکومتوں اور حکومتی شہروں کو بھی معروض وجود میں لایا تھا جس میں خنداون، کاشی، ناگپور اور ٹکشیلا قابلِ ذکر ہیں۔ ستی سر خشک ہونے کے بعد ناگ قوم بالائی علاقوں کے ساتھ ساتھ کریوُں پر بھی آباد ہو گئی۔ اُنہوں نے نیل ناگ کی سر براہی میں کشمیر نام کی

سلطنت قائم کرنے کے علاوہ سرینگر نام کا شہر بھی آباد کیا۔ پچیس سال تک دُنیا بھر کے ناگوں پر کام کرنے والے محقق مارک امارو پنکھم رقم طراز ہیں:

"Kashmir was quickly settled thereafter by waves of colonizing Nagas who made Srinagar (Sri-Nagar-Great serpent) their capital city". 88

مارک امارو پنکھم نے مذکورہ بالا حوالے میں ''سری'' کا عظیم اور ''نگر'' کا ناگ یعنی ''عظیم ناگ'' معنی لکھے ہیں۔ یہ نکتہ اس مقالے کے ذیلی عنوان ''نگر کی ساخت اور ابتدائی تاریخ'' میں پہلے ہی وضح ہوا ہے کہ نگر دو لفظوں ''نگ'' اور ''ار'' سے بنا ہے۔ نگ اصل میں بیشتر جگہ ناموں کا مخفف ہے۔ اس کے ساتھ ''ار'' جڑ نے سے کشمیری رسم الخط میں ''آ'' آواز کبھی حذف ہونے، خاموش رہنے یا گرآنے کا رول نبھاتی آئی ہے۔ مثال کے طور نگر، سلر، دڑگر وغیرہ جگہ ناموں میں[89]۔ اگر ''ار'' کی بات کریں، تو یہ لفظ دراوڑ زبانوں میں جگہ کے ناموں کا لاحقہ ہے جس کے معنی بستی ہیں۔ اسی طرح نگر(نگ +ار) لفظ میں بھی ''ار'' کا عمل دخل ہے جو ناگوں کی بستی (Abode of Nagas) یا شہر کے معنی میں استعمال ہوا ہے[90] جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نگر، ناگ اور دراوڑ ثقافت کا مشترکہ لفظ ہے۔ کشمیر میں ''ار'' لاحقہ کی کئی بستیوں کا نام آج بھی موجود ہیں، جن میں اگر، واگر، داور، ماور وغیرہ شامل ہیں۔ ان سبھی ناموں سے ناگ بستیوں کی بھنک آتی ہے۔ اسے اندازہ ہوتا ہے کہ سرینگر شہر کی بنیاد ناگوں نے ہی ڈالی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر لاحقہ ''ار'' ناگ اور دراوڑ تہذیب کا مشترکہ انگ ہے، تو دراوڑوں کو سرینگر کا بانی کیوں نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ سوال بالکل حق

بجانب ہے۔ جب قوم دراوڑ کی قدیم سیاسی، مذہبی اور لسانی تاریخ کا بغور جائزہ لیا جاتا ہے تو غیر آریا داس، اسُر، ناگ، اور دراوڑ کو ایک دوسرے کا مترادف ٹھہرایا گیا جو مختلف غیر آریا قبائل پر مشتمل قوم ہے [۹۱]۔ اے۔ روی کمار وغیرہ نے ناگ، شدر، شودر اور دراوڑوں کو ایک ہی قوم قرار دے کر انہیں نیندھرتھل نسل سے جوڑ دیا ہے [۹۲]۔ اسی طرح امارک امارو کا یہ دعویٰ کہ ناگ اور دراوڑ ایک ہی قوم تھے، زیرِ بحث مقالے کے حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "Other important city-states of Nagas were founded within the Indus River Valley and include the metropolises of Harrapa and Mohenjo-Daro, both of which had running water, public baths and a sophisticated sewage system "93

اسی طرح اگر یہ بات درست مان کر چلیں کہ موریہ اشوک نے ناگ مت کا قلع قمع کرانے اور بُدھ مت پھیلانے کی غرض سے مدھیانتکا کی سربراہی میں بُدھ بکھشو کشمیر بھیجے تو یہ کسی بھی صورت میں ممکن نہیں تھا کہ وہ اس قوم کے ہزاروں سالہ پُرانے مذہبی عقائد، رسوم، رواج اور ثقافت کو جڑ سے اُکھاڑ کر اس کے نام پر کوئی شہر آباد کرتا۔ ان حالات واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ دعویٰ سے بوئے تعمیر کے بجائے فسطائیت کی بو آتی ہے۔ غرض کہ جس زاویہ سے بھی اس موضوع کو پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، سرینگر اور اشوک کا رشتہ ثابت ہونے کا نام نہیں لیتا۔

ماحصل:

زیرِ بحث مقالے سے منسلک نوشتے سیاق وسباق، بین السطور مطالعہ، تحقیق، تنقید اور مفروضات کے تجزیہ سے جو نتائج سامنے آئے، انہیں رد وقبول کے

کئی مراحل سے گزرنا پڑا اور ہر ایک مرحلے کا اپنا الگ مُنفرد نچوڑ ہے۔ ہر نتیجہ تحقیق کے کسی نہ کسی نکتے کو وا کرنے کے لئے اکساتا ہے۔ تاہم طوالت سے بچتے ہوئے حتمی ماحصل کے مختصر تذکرہ پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ مطالعہ تحقیق سے تاریخ سرینگر کے متعلق جو غالب رجحان سامنے آیا ہے، یوں ہے:

ا......قواعدی اعتبار سے سرینگر دو آزاد مارفیموں یعنی سری اور نگر پر مشتمل ہے۔ سری کی چار ساختی صورتیں یعنی سری(sri)، سرّی(sr-ri)، شری(shri) اور شرّی (shr-ree) ہیں۔ معنیاتی لحاظ سے ان لفظوں میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ سری کے معنی ہیں روشنی، شان وشوکت، عظمت، طاقت، اونچا درجہ، بڑا، عظیم، شاہی وقار اور شخصی رتبہ۔ اس لفظ کا چلن یکساں طور بیشتر آسٹرک، دراوڑ اور آریا زبانوں میں ہے۔ ماسوائے ملیالم زبان، جہاں سری/شری کا کام تھری سے لیا جاتا تھا۔

۲...... بہ لحاظ ساخت، نگر کی کئی شکلیں ہیں جس میں ناگر، ناگرا، نگرا، نگری، ناگری، نگار اور نگارا خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ معنوی اعتبار سے نگر، ناگر، نگرا اور ناگرا لفظوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ نگر اور ناگر لفظ قصبہ، شہر اور بستی جبکہ ناگرا اور نگرا قصبہ یا شہر میں جنم لینے اور پرورش پانے کے معنی میں استعمال ہوتا آیا ہے۔ قصبہ اور شہر میں رہنے والے کو نگری اور ناگری لفظوں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ نگار اور نگارا قصبہ یا شہر میں جنم لینے اور بالغ ہونے کے معنی دیتا ہے۔ نیز یہ الفاظ قبیلہ کی پہچان بھی ہے۔ نگرا ایک فرقہ کا نام ہے جو خاص طور کشمیر سمیت بنگال، مالوہ اور گجرات میں بود باش کرتے تھے۔

نگر دو آزاد مارفیموں ''نگ'' اور ''ار'' سے بنا ہے۔ ''ار'' کے معنی بستی ہیں۔ ابتدائی زمانے میں بستیوں کے نام یک لفظی ہوا کرتے تھے جو اکثر ار، اُر، او، رو، پور سے جانے جاتے تھے۔ جب ان کے ساتھ دوسرا لفظ جُڑ گیا تو تہذیب نے دوسری

شکل اختیار کی۔ مثال کے طور پر: نگ+ار= نگر،سل+ار=سلر، داو+ار=داور وغیرہ۔''ار'' لاحقہ کی بستیاں پورے برصغیر میں پائی جاتی ہیں۔اس لاحقہ کا لسانی رشتہ میسوپوٹمیا، سُمیر، وادی سندھ اور قدیم وجدید دراوڑستان سے جاملتا ہے۔

۳......کہا جاتا ہے کہ سرینگر کو راجہ اشوک نے آباد کیا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ قبل مسیح تاریخ میں اشوک نام کے تین راجہ گزرے ہیں۔ایک اشوک جسے کالا اشوک کہا جاتا ہے، پانچ سوق م میں مگدھ کا حکمران تھا۔دوسرا اشوک مگدھ کے موریہ خاندان کا راجہ تھا جو ۲۶۸ ق م میں تخت پر بیٹھا۔جبکہ گونندہ خاندان کا تیسرا اشوک کشمیر کا راجہ تھا۔ان میں سے سرینگر شہر کو کس اشوک نے بسایا تھا، اس کے متعلق مورخ، محقق اور نقاد الگ الگ نظریہ رکھتے ہیں۔مطلب یہ کہ نظریاتی اعتبار سے مورخ وغیرہ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔قلم کاروں کا ایک گروپ موریہ اشوک کو سرینگر کا بانی ٹھہراتا ہے اور دوسری جماعت نے کشمیری اشوک کو سرینگر کا بانی مانا ہے۔لیکن اس مقالہ میں ان دونوں نظریات کی بجائے ایک اور آرا کا تصوّر ابھر کر سامنے آتا ہے جس سے عندیہ ملتا ہے کہ سرینگر کو نہ پاٹلی پتّر/موریہ اشوک اور نہ ہی کشمیر گونند اشوک نے آباد کیا ہے بلکہ یہ کارنامہ کشمیر کی ابتدائی قوم ناگوں نے انجام دیا ہے جس کا موثر اور معتبر اشارہ تاریخی اور نیم تاریخی نوشتوں، زمان و مکان کی مروجہ سماجی و سیاسی اور تاریخی لسانیات اور تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ سے بخوبی ملتا ہے۔ پھر بھی سرینگر سے منسوب میدانِ تحقیق کے زیرِ بحث نچوڑ کو حرفِ آخر سے تعبیر کرنا قبل از وقت ہوگا۔کیونکہ بقول علامہ سیماب اکبرآبادی۔

میں ہوں اِک مستقل عنوان ہستی کے فسانے میں
مُجھے تاریخ دُھراتی رہے گی، ہر زمانے میں

☆☆☆

حواله جات

۱۔ ڈاکٹر ف۔عبدالرحیم، ۲۰۰۳ء ''پردہ اُٹھادوں اگر چہرۂ الفاظ سے......''چنئی، انڈیا ص، ۵۔
۲۔ قواعدی اعتبار سے مارفیم وہ لفظ ہے جو آزاد اور بامعنی ہو۔مثلاً گھر، کُرسی، چنار، راز وغیرہ۔
3. Malviya,Shrikant, Mishra Rohit, Tiwary UShanker, 2017, "Structural Analysis Hindi Phonetics and A Method for Extraction of Phonetically Rich Sentences from Very Large Hindi text Corpus", P.2
4. Sri-Lexico, Oxford English Dictionary, 2019, P.317
5. Monier Williams, 2012. A Sanskrit English Dictionary, New Delhi, P.1098
6. Tunner, Sir Ralph Lilly, 1962. A Comparative Dictionary of Indo-Aryan Languages, London, P.736
7. Ibid, P.736
8. Oxford English Dictionary, 2019.
۹۔ ڈاکٹر محمد یلیین، ۱۹۷۷ ہندو مذہب کی جھلکیاں، لکھنو، ص، ۴۷۔
۱۰۔ آسٹرک ایک بڑا لسانی خاندان ہے۔لسانی ماہر جارج ابراہیم گریرسن اور پٹر شمٹ نے زبانوں کے اس خاندان کو دو حصوں یعنی آسٹر وایشیٹک اور آسٹرونیشن میں تقسیم کیا۔آسٹر وایشیٹک خاندان کی چار شاخیں ہیں جس میں منڈا (پُرانا نام کول)، مون کھِمر، نکوباری اور ملا کا زبانیں شامل ہیں۔منڈا اور نکوباری زبانیں ہندوستان میں بولی جاتی ہیں۔مون کھمر کی ایک شاخ کھاسی خصوصی طور میگالیا ریاست میں مروج ہے۔مُنڈا وسطی اور شمالی ہندوستان جبکہ نکوباري، نکوبار جزائر کے لوگوں کی زبان ہے۔کشیر (کشمیر) کے قدیم باشندے ناگوں کی زبان بھی آسٹرک تھی تاہم اس کا علاقائی نام ابھی تک پردۂ اخفا میں ہے۔کاشر زبان میں آج بھی آسٹرک جڑوں کا نشان ملتا ہے جس کی صدائے بازگشت آسٹرک خاندان سے وابستہ زبانوں کے لسانی مواد خاص کر علم صرف ونحو وغیرہ میں سُنائی دیتی ہے۔ان زبانوں میں کھاسی، منڈا، نہالی، مونگ، تھائی، اور کھمر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔اس کی تصدیق میں کہا جاسکتا ہے کہ قدیم زمانے میں سرنگر سے لے کر دو میل تک ویتھ (جہلم) کے دونوں کناروں پر کھاسی قوم آباد تھی۔علاوہ ازیں کھاسی لوگ راجوری جموں میں بود باش کرتے تھے اور یہاں کے لوگ آج بھی کشمیری کے ساتھ ساتھ کھاسی (مقامی نام کھسی) زبان بھی بولتے ہیں۔(مزید مطالعہ کے لئے راج ترنگنی کا مطالعہ ضروری ہے)۔
۱۱۔ تگالوک فلپائن کی دوسری سرکاری زبان ہے۔یہ زبان بھوٹان میں بھی بولی جاتی ہے۔
۱۲۔ جاونی زبان انڈونیشیا کے جاوا جزیرے میں رائج ہے۔یہاں پیداوار خاص کر چاول کی دیوی کوسری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
۱۳۔ کھمِر، مُلکِ کمبوڈیا کی سرکاری زبان ہے۔اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۱۴ ملین سے اوپر تجاوز کر گئی ہے۔کھمبر کشمیر میں ایک گاؤں کا نام بھی ہے جو ٹیل بل سے آٹھ اور حضرت بل سرینگر سے گیارہ کلو میٹر دور ہے۔

۱۴ تھائی زبان تھائی لینڈ کی قومی زبان ہے۔

15. www.quora .com/which-come-first.

۱۶ تاریخی لسانیات کے کئی اصول ہیں جو لفظی اور صورتی تبدیلی، لہجہ بدلی، لفظ مسخ ہونے اور نئی شکل اختیار کرنے وغیرہ جیسے عمل کا مطالعہ کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔

17. Gustav Oppert, 1893, "On the Original Inhabitants of Bharatavarsha," Lond on,P.3

18.M. Immanuel, 2002, "The Dravidian Lineages- A socio-Historic Study," Kaniya Kumari, PP.23-24, 26, 39.

۱۹ جنوبی ہندوستان کے دانشور اسکالر اور ادیب سنگما نام کے بینر تلے یکجا ہوئے جسے دراوڑ زبان و ادب خاص کر تامل کو کافی ترقی ملی۔ یہ دور تین سو ق م سے لے کر تین سو عیسوی تک جاری رہا۔

۲۰ سری، شری، تھِری اور تری ایسے ہی اعزازی یا خطابی نام ہیں جس طرح سر (sir)، مسٹر، اچاریہ، بھگت، چکرا بھارتی، دیش مُکھ، جگا دھر گرو، مہاریشی، مہاتما، راجہ ریشی، سوامی، شنکراچاریہ، مہایوگی، جناب، سردار وغیرہ ہیں۔

۲۱ مذکورہ لفظوں کو عقیدہ کے پس منظر میں فوک ادویات کے معنی بھی دیئے گئے۔ ہندومت میں ناگرا ایک قسم کا پودا ٹھہرا ہے جو بخار کو دور کرتا ہے۔ اس بات کا تذکرہ ساتویں صدی عیسوی میں آیوروید پر لکھی گئی ہے ''مادھاوسکٹسا'' نامی کتاب میں ہوا ہے۔ ''راجن گنیتو'' نامی کتاب میں ''ناگرا'' لفظ کو تازہ ادرک اور ''اشتنگا ہرِدیا سمیتھا'' میں خشک ادرک معنی دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کو ایک ویدی کشمیری اسکالر وِگھباتا نے چھٹی صدی عیسوی میں تحریر کیا تھا جس میں قدیم طرز زندگی اور آیورویدی علوم کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔ ناگرا لفظ کے معنی سانپ، مسالہ اور لوہا بھی ٹھہرا ہیں۔

۲۲ نگرا برہمنوں نے تین سو سے سات سو عیسوی کے دوران سِکند گُپتا اور ولبھائی نامی حکمرانوں کے کہنے پر سکند پُران کو ضبط تحریر میں لایا تھا جس کے عوض اُنہیں کافی جاگیر دی گئی۔

۲۳ سا کا وسط ایشیا کے رہنے والے تھے۔ دراوڑوں کے ساتھ اُن کی خاص قرابت داری تھی۔ دوسری صدی ق م میں یہ لوگ ملک ہند سمیت باقی علاقوں تک پھیل گئے تھے۔

24. Dr.Padmanabha Kekunnaya, 1994, A Comparative Study of Tullu Dialects, Govinda Pai Research Centre Udupi , P.33

25. www.tulu-research-blogspot.com

۲۶ قدیم دراوڑستان کا مطلب ہے موجودہ شمالی بھارت بشمول پاکستان و افغانستان، جہاں آریاؤں سے پہلے آسٹرک اور دراوڑ زبانیں مروج تھیں۔ ان زبانوں کے بعض عناصر قدیم و جدید دراوڑستان، کشمیر اور کشمیری زبان میں آج بھی پائے جاتے ہیں۔

۲۷ مشرقِ وسطیٰ میں جن ملکوں اور علاقوں کے نام گنے جاتے ہیں، ان میں ترکی، شام، لبنان، عراق، ایران، اسرائیل، اُردن، سوڈان، لیبیا، یمن، کویت، سعودی عربیہ، قطر، بحرین، عمان، عرب امارات وغیرہ خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔

۲۸۔ ''نگر'' میسوپوٹیمیا اوراس کے گردنواح میں ایک پُرانا شہر ہے۔ پراچین کال میں ملکِ شام سے منسلک ''تل براک'' نام کی ایک چھوٹی سی بستی تھی جو سات ہزار سال ق م میں معرضِ وجود میں آئی تھی۔ چار ہزار ق م میں ''تل براک'' ایک بڑا شہر بن چکا تھا۔ حالات نے اس قدر کروٹ لی تھی کہ تین ہزار ق م کے وسط میں اس شہر کے حدود رقبہ بہت حد تک گھٹ چکے تھے۔ تین سو سال کے دوران حالات میں ایک اور انقلاب انگیز تبدیلی وقوع پذیر ہوئی جس سے حدودِ شہر میں کافی وسعت دیکھنے کو ملی۔ یہاں تک کہ مذکورہ شہر ملک کا دارالخلافہ ٹھہرا۔ دو ہزار تین سو ق م میں شہر ''نگر'' پھر تباہ و برباد ہُوا اور شہرا کادی سلطنت کے زیر نگین آیا۔ آج یہ قدیم آثار کا ایک خاص نمونہ ہے۔

۲۹۔ قدیم میسوپوٹیمیا اوراس کے گردونواح میں جو تاریخی شہر آباد تھے جن کے آثار آج بھی موجود ہیں، ان میں اُرک، اکدّ، اسّور، اُر، لاگاش، اُماہ، نپور، کش، ماری، نگر، بے بی لون، نیمروز، نینوا، پرسی پولس اور ابلا کا نام لیا جاتا ہے۔

30. Eidem Eidem, 1998, "Nagar" In Edzard, Dietzatto (ed), Nab-Nuzi: Reall Exikom der Assyriologie and Vorderasiatischen Archaologie, I Walter de Gruyter, P.75, CF www.nagardietzatto.com

۳۱۔ سامی لسانی خاندان میں ''گ'' حرف مروج نہیں ہے لیکن میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق) میں وسط ایشیا خاص کر ایرانی زبانوں، میڈیا اور عیلامی زبانوں کی اثر کے باعث عراقی عربی میں ''گ'' داخل ہو چکا تھا۔

32. Dr. Naval Viyogi, 1995, The Founders of Indus Valley Civilization and Their Later History, Delhi, P, 27.

33. Dr. Naval Viyogi, 1995, The Founders of Indus Valley Civilization and Their Later History, Delhi, P, 27.

۳۴۔ دکشی پُترا پانی شمالی بھارت کے شلا تورا گاندھارا (موجودہ پاکستان) کے مقام پر پانچویں صدی ق م میں پیدا ہوئے تھے۔

۳۵۔ اشٹ آدھیائی یعنی آٹھ مضامین (چپٹر) پر مبنی سنسکرت گرائمر۔

۳۶۔ سُواستووادی ایک قصبہ کا نام تھا جو بگڑ کر موجودہ سوات وادی (پاکستان) کے نام سے مشہور ہے۔

37. Vasudeva Saran Agrawala, 1953, India as Known to Panini, University of Luckhnow, P. 69.

۳۸۔ کلاڈیئس ٹالومی زائد از دو ہزار سال پہلے یونان میں پیدا ہوئے۔ پوری زندگی اسکندریہ (مصر) میں گزاری۔ وہ نقش نگاری، جغرافیہ، ریاضی، فلسفہ، نجوم، شاعری اور علوم فلکیات کے ماہر تھے۔

39. Mahandra Singh Arya and Others, 1998, Adhunik Jat Itihas, P.260.

40. D.D. Kosambi, 2000, The Culture and Civilization of Ancient India in Historical Outline, New Delhi, P. 157

۴۱۔ ''سیر'' نام کی یہ بستی آج سیر ہمدان سے مشہور ہے جو اننت ناگ سے ۱۳ کلو میٹر کی دوری پر پہلگام کے راستے پر واقع ہے۔ اس گاؤں میں موئے مقدس حضورؐ اور زیارت شاہ ہمدان بھی ہے۔ ''سیر'' نام کا

ایک اور چھوٹا سا گاؤں پلوامہ کے ترال علاقے میں ۲۵ کلومیٹر دوری پر آری پل نامی میں واقع ہے۔ گری سیر ایک اور چھوٹا گاؤں بجبہاڑا (تجبیور) انت ناگ میں واقع ہے۔ جبکہ اس نام کی مزید بستیاں جموں و کشمیر میں آباد ہیں جن میں سیر جاگیر سوپور، ژندر سیر پٹن بارہمولہ اور سیر رنبیر سنگھ پورہ جموں قابلِ ذکر ہیں۔

۴۲۔ محمد اعظم دیدمری ۲۰۰۱، واقعاتِ کشمیر، مترجم پروفیسر شمس الدین احمد، سرینگر، ص ۴۹۴-۴۹۸- فٹ نوٹ، ۴۹۔

43.Goerge Buhler,1877,Detailed Report of A Tour in Search of San-skrit, London, Verse, 104, P. 1xxxi

۴۴۔ پنڈت کلہن، راج ترنگنی، جلد اوّل، ص- ۲۴۴، فٹ نوٹ- ۱۴۸، ص، ۲۳۰۔

45. Kalhana's Rajtaranagini, 1979, M.A. Stein(tr), Vol.I, verse, 104, Delhi, P. 19.

۴۶۔ محمد اعظم دیدمری، ۲۰۰۱، واقعات کشمیر، مترجم۔ پروفیسر شمس الدین احمد، فُٹ نوٹ، ۴۹، ص، ۴۹۷۔

۴۷۔ محمد الدین فوق، ۲۰۰۳، تاریخِ کشمیر، سرینگر، ص، ۹۰۔

۴۸۔ محمد اعظم دیدمری، ۲۰۰۱، واقعات کشمیر، سرینگر، فٹ نوٹ، ۴۹، ص، ۴۹۷۔

۴۹۔ شش کلیتر کی نشاندہی بڈگام میں واقع ''ہوکھ لیتر'' بستی کے طور کی گئی ہے۔ بقول حسنؔ، اشوک نے وترہیل [بڈگام] نام کا گاؤں بھی آباد کیا ہے۔

۵۰۔ ''وتشتاتر'' کی بستی کی شناخت ویری ناگ کے مغرب میں واقع ''ویتھ ووتُر'' گاؤں کے طور ہوئی ہے۔

۵۱۔ وجیشورہ، موجودہ بجبہاڑہ انت ناگ۔

۵۲۔ جو مندر مسمار ہوا، اس کے متعلق سبھی مورخ خاموش ہیں کہ وہ ناگ مندر تھا یا اور کسی عقیدے سے اس کی وابستگی تھی۔

۵۳۔ ڈی۔ڈی۔ کوسمبی، ۱۹۷۹ء قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب: تاریخی منظر میں، دہلی، ص، ۲۴۶۔

54. Teresa Miazek, The Legend of Ashoka Hell and References to the Torture Chamber of the Mauryan Emperor in Ajneya's play "Uttar Priyadarsi" "Academic Journal of Modern Philology",Vol.14, 2021, PP. 274-275, Chicago

55. Romila Thapar, 1973, Asoka and the Decline of the Mauryas, New Delhi, P. 29.

56.David Brazier,2002,The New Buddhism, New York,P.59.58

۵۷۔ راج ترنگنی، ص، ۹۶، تاریخ حسن، ص، ۳۸، واقعات کشمیر، ص، ۴۹۷۔

58.Kalhana's Rajtarangni, Vol.I, Delhi, Verse,102,P, 19.

59.D.R.Bandarikar,1925,Asoka,Calcutta,P.77.

۶۰۔ اجیوکا فرقہ کے لوگ جین مت کے پیروکار تھے البتہ بعض تجزیہ نگاروں کو یہ آرا ہضم نہیں ہوتی۔

61. Strong John. S, 1989, The Legend of King Asoka: A

Study and Translation of the Asokavadana, New Delhi,PP.232-233.
62. Gananath Obeyesekere, 2002, Imagining Karma: Ethical Transformation In Ameriondian, Buddhist and Greek Rebirth, California, PP,172-173.
63.Upinder Singh, 2008, A History of Ancient and Early Medieval India from the Stone Age to the 12th Century, New Delhi, P.147.
64. Ibid, P. 147.
65. Bruce Rich, 2010, To Uphold the World: A Call for a New Global Ethic from Ancient India, Bostan, P. 147.
66. Geshe Tashi, Tsering, 2006, The Four Noble Truths, Boston P. 35.
67. Monier William, Sanskrit-English Dictionary, S.V Jina and Buddha. CF. W. P. Ananda Guruge, 1995,P 189
68. Diyya Vadana edited. P. L.Vidya, Dharbhanga, 1959, P.232
69. Abul Fazl, 1873, Aayin-i- Akbari, tr. H. Blochmann, Vol. I, P. 579 and Edward Thomas, 1877, Jainism: The Early Faith of Asoka, London, PP. 30-31.
70. K. A. Nilakanta Sastri, 1988, Age of the Nandas and Mauryas, New Delhi, P. 208.
71. W. P. Ananda Guruge, 1995, Emperor Ashoka's Place in History -A Review of Prevalent Opinion in King Ashoka and Buddhism, edt. Anuradha Seneviratna, Sri-Lanka, PP. 185-188.
72. John. S. Strong, 1983, the Legend of King Asoka -A Study and Translation of the Asokavadana, New Delhi, P. 41.
73. Anuradha Seneviratna, 1994, King Asoka and Buddhism (edt). Sri-Lanka. P.221.
۷۴ کلہن نے جس ماخذ سے بھی انفارمیشن اخذ کی، ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ سرینگر کو بسانے کی بات کلہن سے سولہ سو برس پہلے کی بات ہے۔ اس لئے اس مسئلے کی تہہ تک پہنچنا انتہائی مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ دوسری بات یہ کہ کلہن کا ماخذ بھی دستیاب نہیں ہے۔

75. www.wisdomlib.org>nagari

۷۶ چھ سو ق م سے لیڈیا ایک آزاد مملکت رہی ہے۔ چھٹی صدی ق م میں یہ ملک فارس کے ہخامنشی حکمرانوں کے قبضہ میں آیا۔ لیڈیا سلطنت اصل میں 1180 ق م کے دوران ہیٹی حکمرانوں کے زوال کے بعد معرضِ وجود میں آئی تھی۔ چاندی کے بنے ہوئے لیڈیا کے سکّے قدیم ترین سکّوں میں شمار ہیں جس کی تاریخ آٹھ سو ق م کے لگ بھگ مانی جاتی ہے۔ یہ علاقہ آج کل ترکی میں واقع ہے

77. William E Metcalfe, 2016, the Oxford Handbook of Greek and Roman Coinage,Oxford,PP 63-64

78. ibid, PP.63-64.

79. Michael Mitchiner, 1978, The Ancient and Classical World, P.44.

80. Rama Shankar Tripathi, 1942, History of Ancient India, Banaras, P. 84.

81. The History of Herodotus, 1936, ed. E. H. Blakeney, Vol, I, London, PP. 152, 177.

82. H. R. Chaudhuri, 1927, Political History of Ancient India, Calcutta, PP. 147-158.

83. P.N.K.Bamzai, 1980, Kashmir and Central Asia, New Delhi P. 50.

۸۴۔ پرتاب شیل راجہ گگلندر / کھگلندر / خگلندرھر کا پوتا تھا۔ پرتاب شیل اُن باون گم شدہ راجوں میں سے ایک ہے جو تاریخ رتنا کر میں درج تھے۔ ان بادشاہوں کو حسن شاہ کھویہامی اور محمد الدین فوق نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ راجہ نے کوہ اُلر کے دامن میں پرتاب نگر نام کا شہر بنایا اور مچھ بون میں پرتاپ شور مندر کی بنیاد بھی ڈالی۔

۸۵۔ راجہ لارک چند کی تعمیر میں لارک نگر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ پرگنہ لار میں کوہ وترگنگ کے دامن میں اُس نے یہ وسیع و عالیشان شہر جو آج لار کے نام سے مشہور ہے، بنایا۔ دامن کوہ سے مذکورہ راجہ نے لاری نامی سے ایک نہر بھی تعمیر کی تھی۔

۸۶۔ تاریخ ملک حیدر چاڈورہ۔ ص،۷۔

۸۷۔ مزید تفصیلات اس مقالے کے ذیلی عنوان ''سرینگر کی بُنیاد، مختلف نظریہ'' میں پڑھیے۔

88. Mark Amaru Pinkham, 2010, Return of the Serpents of Wisdom, USA, P. 111.

۸۹۔ سلر لفظ کو رومن میں Salar، نگر کو Nagar اور دڑگر کو Dragar حروف سے لکھا جاتا ہے۔ لیکن رومن میں ان لفظوں کو کشمیری یا غیر کشمیری اس طرح پڑھے اور ادا کرے گا۔ مثال کے طور پر سالار، ناگر اور دَڑگر۔ لسانیات کے اس ماحول نے اور بھی بہت سی زبانوں کے جگہ کے ناموں کو متاثر کیا ہے۔

۹۰۔ مُفصل تفاصیل کے لئے اس مقالے کا ذیلی عنوان ''نگر کی ساخت اور ابتدائی تاریخ'' کا مطالعہ کیجئے۔

91. Dr. B. R. Ambedkar, 1948, The Untouchables, Delhi, P.110.

92. Ravikumar A, Parameswara Achutha Kurup, 2023,

The Nagas, Neanderthals, Shudras, Dravidians and Serpent, Kerala,PP 2-17
93. Mark Amaru Pinkham, 2010, Return of the Serpents of Wisdom, USA, P. 110.

☆☆☆

☆......اقبال احمد

ضربِ کشمیر............(قسط۲)

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب شمال مغربی ہندوستان پر موریا خاندان کی حکومت تھی، اس دوران کوہِ ہندوکش کے اُس پار یعنی ہندوستان کے شمال و مغرب کی جانب سلوکُس (Selecuids) کی ایک بہت بڑی سلطنت قائم ہوئی تھی۔ بکتر جسے آج بلخ کے نام سے جانا جاتا ہے، اس سلوکُس سلطنت کی ایک اکائی تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں پر سلوکُس کے حکمران اپنے اپنے وائسرائے مقرر کرتے تھے۔ ان میں ایک اہم وائسرائے ڈایوڈاٹس (Diodotus) کہلاتا تھا جس نے تقریباً دو سو پچاس (250BC) قبل مسیح میں سلُوکس سلطنت سے بغاوت کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور بکتر یونانی (Bactrin Greeks) نامی ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت ہندوکش کے اُس پار قائم ہوئی اور دھیرے دھیرے اِس سلطنت نے اپنے آپ کو مضبوط کر لیا۔ ادھر اس بار مہاراجہ اشوک کی موت کے بعد موریا سلطنت کمزور پڑ گئی اور یہاں مرکز میں پُش مترا (Pusyamitra) جو موریا افواج کا سربراہ تھا، نے موریا سلطنت کا خاتمہ کیا اور سُنگاہ (Sunga) نامی ایک نئی سلطنت کا قیام عمل میں لایا۔

موریا سلطنت کے زوال پذیر ہونے کے ساتھ ہی بکتر یونانی نامی سلطنت کے وائسرائیوں نے ہندوکش کے جنوب میں پیش قدمی کی اور شمال مغرب کے بیشتر علاقے جو موریا سلطنت کے زیر اثر تھے، سب اپنے قبضے میں لائے۔ اِن علاقوں میں

موجودہ ددور کے قندھار، پشاور، پنجاب، کشمیر اور شمالی ہندوستان کے دوسرے علاقہ جات شامل تھے۔ اس طرح یہاں ایک نئی سلطنت کا قیام عمل میں آیا جسے مورخین نے ہند یونانی سلطنت یعنی Indo-Greek Empire کا نام دیا ہے۔ یہ عمل تقریباً دوسو سال قبل مسیح (200 BC) سے شروع ہوا ہے اور بڑی مدت تک قائم رہا۔ اس سلطنت نے دھیرے دھیرے تمام شمال مغربی ہندوستان پر مشتمل ایک وسیع العریض سلطنت کا قیام عمل میں لایا اور ایک نئی کرنسی کا آغاز بھی کیا۔ چونکہ اس خاندان کی تاریخ کے دستاویزی ثبوت کمیاب ہیں اور مورخین نے چند ہندوستانی ،چینی اور یونانی روایات سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ تر انحصار اِس خاندان کے دریافت شدہ سکہ جات ،آثارِ قدیمہ کی مصنوعات اور کتبّات پر کیا ہے۔ ابھی تک کی تحقیق کے مطابق تیس ایسے ہند یونانی Indo-Greek بادشاہوں کے سکّے دریافت ہو چکے ہیں ،جنہوں نے یا تو یکے بعد دیگرے یا ساتھ ساتھ شمال مغرب ہندوستان پر تقریباً ایک سو سال تک حکومت کی ہے۔ اس دور کو ہندوستانی تاریخ میں ہند یونانی دور یعنی (Indo-Greek Empire) اور ان کے بادشاہوں کو ہند یونانی بادشاہ یعنی Indo-Greek Kings کے نام سے جانا جاتا ہے۔

مجموعی طور اِس دور میں دو خاندان حکمران رہے ہیں۔ ایک خاندان کی سربراہی یُکر یٹوس (Eukritidus) کر رہا تھا اور جن دوسرے بادشاہوں کے نام اُس دور کے سکوّں سے دریافت ہوئے ہیں اِن میں سے نیچے دیئے گئے یہ نام قابل ذکر ہیں۔

آپالوڈاٹس	Appolodotus
منندرا	Menandra
اینٹمکس	Antimachus

آرچبس	Archibus
لاسیز	Lysis
ہپوسٹرٹس	Hippostratus
ہرمایوس	Harmous
سٹراتو	Strato
زیولس	Ziolies
ہیلی کلس	Halikels
آگاتھولیس	Agathocels

جہاں تک کشمیر میں یونانی دور کے اثرات کا تعلق ہے یہاں کی مقامی روایت اور تاریخ کے تنقیدی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ انڈوگریک سلطنت کی سرحدیں یہاں تک پھیلی تھیں۔ کلہن پنڈت اپنی ''راج ترنگنی'' میں کئی باہری قبیلوں کا ذکر کرتا ہے جن میں یاونا اور ملیچاز کا نام بھی آیا ہے۔ ان قبیلوں کے سرداروں نے یہاں اُس دور کے راجاؤں پر چڑھائی کی ہے۔ یاونا قبیلے کا ذکر یہاں کی لوک روایت میں بھی آیا ہے۔ یہ لوگ لمبے قد اور نہایت ہی خوب رو رہے ہیں۔ آج بھی کشمیر میں خوبصورت لوگوں کو ''یاوا'' کہتے ہیں، جس کے معنی خوبصورتی کے ہیں۔ ان ہی ''یاوناز'' کا تعلق یونانی قبیلے سے مانا جاتا ہے جس کا ذکر کلہن پنڈت نے اپنی تصنیف ''راج ترنگنی'' میں کیا ہے۔

دوسری طرف تاریخ میں ایسے یونانی نامی گرامی بادشاہوں کا ذکر آیا ہے جن کے متعلق یہ گمان ہے کہ وہ کشمیر میں اپنے زمانے میں مقبول رہے ہیں۔ اِن میں ڈیمٹرس (Demetrous) اور منندر (Menander) شامل ہیں۔

ڈیمٹرس (Demetrous) کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ ایسی انڈو

گریک سلطنت کا بادشاد بنا جس کی سلطنت کی حدود میں جنوبی کشمیر کے حصّے بھی شامل تھے۔ اسی طرح (Menandera) منندرا کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ اس کے اور بدھ مت کے ایک درویش کے درمیان جو پہلی گفتگو ہوئی ہے وہ ایک ایسی جگہ ہوئی ہے جو کشمیر سے صرف بارہ یوجنا کی دوری پر واقع تھی۔ اس بدھ راہب کا نام ناگاسینا (Nagasena) اور جگہ کا تعین ہاروَن سے کیا گیا ہے، جو سرینگر سے کچھ ہی دوری پر واقع ہے۔ چونکہ اس زمانے میں شہر سرینگر کو بھی کشمیر کے نام سے ہی موسوم کیا جاتا رہا ہے، اس لئے ہاروَن ہی وہ جگہ ہے جہاں اِن دونوں کی ملاقات ہوئی ہے۔

دوسری طرف جموں و کشمیر کی مختلف جگہوں سے بھی کئی یونانی باشاہوں کے سکّے دریافت ہوئے ہیں۔ ابھی تک جن یونانی بادشاہوں کے سکّے یہاں پائے گئے ہیں، ان میں آپالوڈاٹس، منندرا، آرجیس، ہپوسٹرٹس، ہرمایوس کے سکّے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ایک کتبہ بھی دریافت کیا گیا ہے جس پر مہاراجہ منندر کا نام آیا ہے۔ ایسے سکّے یہاں جنوبی اور شمالی کشمیر سے بھی دریافت ہو چکے ہیں۔

سب سے پہلے ایسے سکّوں کی دریافت کا دعویٰ آثارقدیمہ کے مشہور و معروف ماہر Alexander Cunnigham نے انیسویں صدی میں کیا۔ انہوں نے اپنی ایک کتاب میں دعویٰ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُنہوں نے اوپری جہلم وادی سے کئی یونانی سکّے دریافت کئے ہیں۔ J.B.Bleazby نامی دوسرے سکہ شناس نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ایسے کئی سکّے، یہاں کے سب سے پرانے میوزیم (ایس۔پی۔ایس میوزیم) سے دریافت کئے ہیں، جن کی انہوں نے ایک فہرست بھی مرتّب کی تھی۔

دورِ حاضر میں (1980-83) میں جو کھدائی سیمتھن بجبہاڑہ میں کی گئی وہاں سے ایک کتبے کے ساتھ کئی پنچ مارکہ، یونانی، ستھین اور کشان دور کے سکّوں کی

دریافت ہوئی ہے۔اس کے علاوہ جموں وکشمیر کی دوسری جگہوں سے بھی وقتاً فوقتاً ایسے کئی سکّے لوگوں کے ہاتھ آئے ہیں جن کا اندراج یہاں کسی بھی ریکارڈ میں نہیں ہوا ہے۔البتہ کئی ایسے یونانی سکوّں کا ذکر جو کشمیر سے باہر چلے گئے ہیں، کتبِ سکّہ جات میں بھی آیا ہے اور انہیں اُن کتابوں اور مضامین میں جموں وکشمیر کے کھاتے میں ڈالا گیا ہے۔اس طرح صاف ظاہر ہے کہ ہندیونانی دور (Indo-Greek Period) کے سکّے جموں وکشمیر سے بھی دریافت ہو چکے ہیں۔چونکہ انڈوگریک بادشاہوں کی زیادہ تر موجودگی کی شہادت ہمیں ان کے سکہ جات سے ملتی ہے، اس لئے جموں وکشمیر میں بھی یہ شہادت زیادہ تر انہی سکوّں کی دریافت سے ملتی ہے۔ مہاراجہ منندر جس کے نام پر یہاں ممندر اشوپیان اور مینڈر پونچھ Menandar Poonch,Memendar Shopian جیسے مقامات بھی پائے جاتے ہیں۔ سنگلا یعنی آج کے سیالکوٹ جو جموں سے تھوڑی دور پر واقع ہے، میں اپنا دارالخلافہ بھی قائم کیا تھا۔اس بادشاہ کے سکّے بھی یہاں کئی جگہوں سے دریافت ہو چکے ہیں۔

یونانی سکّے Indo-Greek Coins چن پدھ اور موریا دور(600 ق۔م سے 225 ق۔م) میں ہم نے یہ جان لیا کہ یہاں پنچ مارکہ Punch Marka سکّے کا دور دورہ رہا ہے۔یہ سکّہ ہندوستان کا قدیم ترین سکّہ رہا ہے جو تانبے اور چاندی میں ڈھالا جاتا رہا ہے۔ان پر مختلف نشان کندہ کئے جاتے تھے۔ البتہ اِن پر کوئی عبارت درج نہیں ہوئی تھی۔لیکن یونانی دور میں شمال مغربی ہندوستان میں ایسی کرنسی کا آغاز ہوا جو یہاں بڑی مدت تک جاری رہا۔ یہ پہلی بار تھا جب یہاں سے تحریر شدّہ سکّے (Inscribed Coins) کا آغاز ہوا۔

ہندوستانی بادشاہوں نے یہاں سے یونانی سکّے کی شروعات کی۔اِن کے پہلے دور کے سکّے چاندی اور تانبے میں ڈھالے گئے۔ اِن کے یہ سکّے

(Attic یعنی یونانی وزن یعنی Drachm یعنی دِرہم کہلائے۔ جنہیں انہوں نے اپنے یونانی وزن یعنی (Weight Standard) پر ڈھالا ہے جو یہاں کے وزن کے مطابق تین سے چار گرام کا درہم بن گیا ہے۔ اُن کی چونّی بھی درہم معلوم ہوتی ہے، جس کا وزن بارہ سے سولہ گرام کا ہے۔ اُن کے سکّے شکل میں گول اور چکور ہیں جو انتہائی نفاست کے ساتھ ڈھالے گئے ہیں۔ سکّے کی ایک طرف بادشاہ کی شبیہہ (Bust of the King) جبکہ دوسری طرف اپنی کئی یونانی دیوی دیوتاؤں کو دکھایا گیا ہے۔ سکّے کے چہرے یعنی Obverse سائڈ پر بادشاہ کی شبیہہ کے ساتھ یونانی تحریر میں بادشاہ کا نام اپنے القاب کے ساتھ دیا گیا ہے، جیسے کہ ڈایوڈاٹس Diodotus کے سکّے پر ایک طرف بادشاہ کی شبیہہ اور دوسری طرف یونانی دیوتا زیس Zeus کو دکھایا گیا ہے۔ اس پر یہ عبارت درج ہے Basilions Anti Mocus جس کے معنی ہے مہاراجہ انٹما کُس یعنی یہ سکّہ اِس بادشاہ نے اپنے ہیڈ مہاراجہ کے نام جاری کیا ہے۔ اسی طرح دوسرے سکّوں پر بھی بادشاہ کی شبیہہ یونانی دیوی دیوتاؤں اور یونانی عبارت کو دکھایا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یہ سکّے ہندوستان کی سرزمین سے جاری ہونے لگے تو اِن میں کچھ تبدیلیاں لائی گئی ہیں۔ سب سے بڑی تبدیلی سکّے کی تحریروں میں لائی گئی ہے۔ اِن سکّوں پر ایک ہی عبارت درج ہوتی تھی جو یونانی رسم الخط میں ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب یونانی تحریر کے ساتھ ساتھ ہندوستانی رسمُ الخط یعنی کھروشٹی کو بھی سکّے کی ایک طرف جگہ دی گئی اور ہندوستان کی قدیم زبان پراکرت اور سنسکرت میں بادشاہ کا نام اور لقب دیا گیا۔ چونکہ کھروشٹی رسمُ الخط اس زمانے میں شمال مغربی ہندوستان میں رائج تھا اور یہاں کی قدیم زبانیں پراکرت اور سنسکرت اِسی رسم الخط میں تحریر کی جاتی تھیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے سکّوں کے وزن کو بھی کم کیا اور اُنہیں یہاں کے رائج الوقت پنچ مارکہ سکّے کے وزن کے برابر

کردیا۔ دھیرے دھیرے اُنھوں نے اپنے سکّوں میں ہندوستانی رنگ بھردیا اور ہندوستانی Weight Standard رسم الخط زبان کے ساتھ ساتھ یہاں کی دیوی دیوتاؤں، جانوروں اور دیگر ایشیا کی شبیہات ڈالنا بھی شروع کردیا۔ جیسا کہ اُن کے دریافت شدہ سکّوں سے ظاہر ہے۔ لگ بھگ ہر سکّے کی ایک طرف ہندوستانی کھروشٹی حروف جودائیں سے بائیں کی طرف لکھے جاتے ہیں۔ سنسکرت اور پراکرت میں عبارت درج ہے۔ رسم الخط بھی ہندوستانی اور زبان بھی ہندوستانی۔ کئی سکّوں پر ہندوستانی شیر، ہاتھی اور بیل کی تصاویر بھی کندہ کی گئی ہیں۔ جبکہ چند سکّوں پر ہندوستانی دیوی دیوتاؤں مثلاً شِوا سکّے یونانی مہارانی اگاتھلولیس کی جانب سے جاری ہوئے ہیں۔

چند یونانی سکّوں کی تفاصیل درج ذیل ہیں جو یہاں دریافت ہوئے ہیں۔

1. Deme frons wearing elephant scalp

(دیمٹرس ہاتھی کی کھوپڑی پہنے ہوئے)

دھات۔۔۔چاندی چوکنی درہم بالمقابل (Obverse) =

(بادشاہ کی شبیہہ ہاتھی کی کھوپڑی پہنے ہوئے)

اُلٹا (Reverse) =

(یونانی دیوتا زِیس (Z e u s) کی شبیہہ کھڑی یونانی رسم الخط میں Basilions Demetoons یعنی راجہ ڈیمٹرس۔)

2. Menandar wearing helmet......

(مننددر ہیلمٹ پہنے ہوئے)

درہم دھات۔۔۔۔چاندی، بالمقابل (Obverse)

(بادشاہ کی شبیہہ ہیلمٹ پہنے ہوئے)

یونانی عبارت Basilions Basilion Menandrusa

معنی مہاراجہ منند را

اُلٹا (Reverse)

یونانی دیوتا پلاس اپنے دائیں ہاتھ میں ڈھال لئے ہوئے۔

کھروشٹی عبارت

مہاراجہ راجہ دیراجسا منند رسا۔

3. Apollodotus square coin

اپالوڈاٹس

دھات۔۔۔چاندی، درہم بالمقابل (Obverse):

(ہاتھی کی شبیہہ چلتے ہوئے)

یونانی عبارت

Basilion Basilion Apollodotoy

یعنی مہاراجہ اپالو

اُلٹا (Reverse): چلتے بیل کی شبیہہ

کھروشٹی عبارت

مہاراجاراجدراجا اپالوڑتسا

Hippostratus selling coin

ہپوسٹراٹس کے چاندی کے سکّے

دھات، چاندی، چوگنی درہم بالمقابل Obverse :

(تاج پہنے ہوئے بادشاہ کی شبیہہ)

یونانی عبارت میں

Basilions Basilions ippostratus

یعنی مہاراجہ ہیوسٹراٹس

اُلٹا (Reverse):

بادشاہ گھوڑے پر سوار

عبارت کھروشٹی میں

مہاراجاراجہ دیراجسا ہیوسٹراٹس

غیر ملکی قبیلے:

موریادور کے قدیم آثار اور اس دور کے سکّے جو یہاں دریافت ہوئے ہیں اِن سے پتہ چلتا ہے کہ موریا دور کا یہاں اثر رہا ہے۔ دوسری طرف جس مہاراجہ اشوک کا ذکر ''راج ترنگنی'' میں بار بار آیا ہے وہ کوئی دوسرا اشوک نہیں بلکہ مورین دور کے اشوک کا ہی ہوسکتا ہے، جو اس زمانے میں فتوحات اور انتقامی امور کے لئے نہایت مشہور رہا ہے۔ اگر چہ ''راج ترنگنی'' میں اُس کا زمانہ دوسری کتبِ تاریخ سے مختلف دیا گیا ہے مگر جو دوسری باتیں اس مہاراجہ کے متعلق اِس تاریخ میں درج ہیں وہ مہاراجہ اشوک ہی سے میل کھاتی ہیں۔ اس لئے یہاں جو ماہرین ہیں اُن کی رائے میں جس مہاراجہ اشوک کا ذکر ''راج ترنگنی'' میں آیا ہے وہ کوئی دوسرے نہیں بلکہ مورین خاندان کے مہاراجہ اشوک ہیں۔

دوسری طرف ''راج ترنگنی'' کے تنقیدی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں جن قدیم راجاؤں کی فہرست مرتّب کی گئی ہے اُس میں ایک تو زمانے کا کافی فرق نظر آتا ہے اور دوسرا اس میں ایسے راجہ مہاراجہ کا نام بھی آیا ہے جن کا سرے سے ہی کوئی وجود نہیں جبکہ جو دوسرے راجہ مہاراجہ جن کا نام اس میں دیا گیا ہے، اُن کا زمانہ بھی بہت اوپر نیچے دیا گیا ہے۔ الیکزنڈر کننگھم Aelxander

Cunnigham ''راج ترنگنی'' کے تنقیدی جائزے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ یہاں کے کئی دریافت شدہ دینار(Dinar Coins) جو اصل میں کدار دور کے سکّے ہیں لیکن اُن سکّوں کو اُن کے آگے والے دور کے کھاتے میں ڈالا گیا ہے۔ان راجاؤں کا نام ''راج ترنگنی'' میں اُس جگہ دیا گیا جو تحقیقی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ کننگھم کی رائے میں یہ سکّے کدار عہد کے سکّے ہیں لیکن ''راج ترنگنی'' میں اس دور کا ذکر کہیں بھی نہیں آیا ہے۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ''راج ترنگنی'' میں کئی ایسے قدیم دور کے راجاؤں کے نام دیئے گئے ہیں ،جن کے بارے میں ہمیں آثارِقدیمہ یا سکّہ جات سے متعلق کوئی شہادت میسّر نہیں ہے اور دوسرے کسی قلمی نسخہ یا کتبے میں بھی اُن راجاؤں کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے ۔ چونکہ ''راج ترنگنی'' کی تحریر جس نے لغوی معنی ہیں ''بادشاہوں کے دریا'' بارہویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے۔اس میں زمانہ قدیم کے بارے میں زیادہ تر افسانوی داستانیں پائی جاتی ہیں۔اس دور میں کلہن پنڈت کو آثارقدیمہ،سکّہ جات اور کتبے جیسی شہادتیں میسر نہیں تھیں۔لگتا ہے کہ اُس کی تحریروں کا زیادہ تر انحصار لوک کہانیوں اور روایتوں پر تھا اس لئے اس میں جو ابتدائی دور کی تاریخ لکھی گئی ہے اس میں بعض حقیقی تاریخی پہلو نظرانداز ہوئے ہیں اور اُن ادوار کے بارے میں بہت کم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔اس تاریخ کے تنقیدی جائزے جو کئی ملکی اور غیر ملکی ماہرین نے لئے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ اس میں جن پدھ موریا ہند یونانی، ہند تھین ، ہند پارتھین کستان، کدار اور ہون جیسے پُرانے ادوار کی تاریخ نہ ہونے کے برابر ہے۔اِن ادوار کے صرف دو تین بادشاہوں کا ذکر آیا ہے اور جس میں زمانے کا فرق پایا جاتا ہے۔جبکہ اس دوران کلہن پنڈت نے کچھ ایسے خاندانوں اور راجہ مہاراجوں کی کہانی پیش کی ہے جس کا کسی دوسرے ماخذ میں تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ البتہ کلہن پنڈت نے چند ایک غیر ملکی قبیلوں اور بادشاہوں کا ذکر کیا ہے ،جن کے

بارے میں ہمیں آثار قدیمہ اور سکّہ جات کی تحقیق سے بھی کچھ شہادت ملتی ہے۔

قدیم دور کے جن غیر ملکی قبیلوں کا ذکر کلہن پنڈت نے کیا ہے ان میں ملیچاز، یاوناز اور تورکھا Yavnaz, Malechies and Turkhas کا نام بھی شامل ہے۔ چند ایک بادشاہ جن کا ذکر کلہن کی ''راج ترنگنی'' میں آیا ہے، جن میں کنشک، ہوشک، جولکا اور مہرکل شامل ہیں۔ یہ جو پہلے تین راجاؤں کا نام آیا ہے وہ کشان دور کے مشہور و معروف بادشاہ گزرے ہیں اور مہرکل ہون دور کے بادشاہ رہے ہیں۔ بادشاہوں کی تفصیل ہمیں دوسری کتبِ تاریخ اور سکہ جات سے بھی ملتی ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

چند غیر ملکی قبیلوں اور اُن کے بادشاہوں جن کے بارے میں ہمیں انیسویں اور بیسویں صدی کے آثارِ قدیمہ، سکہ جات اور دوسرے کئی معتبر ذرائع کی تحقیق سے معلومات حاصل ہوئی ہیں، ''راج ترنگنی'' میں اُن قبیلوں اور اُن کے بادشاہوں کا خاص تذکرہ نہیں ہے، لیکن اشارہ ان ادوار کی طرف ہے جنہیں ہندوستانی تاریخ میں انڈو گریک، انڈو سیچن، انڈو پارتھین، کشان، کدار اور ہون ادوار کا نام دیا گیا ہے۔ اگرچہ کشان اور ہون دور کے چند ایک بادشاہوں کا ذکر ''راج ترنگنی'' میں تھوڑا بہت آیا ہے لیکن پہلے تین ادوار کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ زمانہ موریا دور کے زوال پذیر ہونے کے ساتھ کشان کے عروج تک زمانہ ہے جو لگ بھگ تین سو سال یا اڑھائی سو سال کا زمانہ آتا ہے (250BC-100AD)۔ اِن ادوار کے لئے ہمیں ''راج ترنگنی'' کو چھوڑ کر دوسرے ماخذات کا رُخ کرنا پڑتا ہے، جن میں بڑھسٹ لٹریچر، یونانی دستاویزات، قدیم ہندوستانی ماخذ اور سب سے بڑھ کر آثارقدیمہ اور سکّہ جات جیسے اہم ماخذ شامل ہیں۔ اِن ماخذات کی تحقیق یورپی اور ہمارے ملک کے دورِ جدید کے مورخین، آثارِ قدیمہ اور سکہ جات نے نئی بنیادوں پر کی

ہے۔

ان ماہرین میں الیکزنڈر کننگھم ،ڈبلیو۔ڈبلیو ٹارن،سر جان مارشل،ٹرینچر ، یم ۔اے سٹائین،جان روشن فیلڈ،بی ۔این مکھر جی ،اوپندر ٹھاکر،ڈیوڈ میکڈونلڈ ،احمد حسین دانی،ڈاکٹر پی ۔سی گپتا،مشل میچر ،اوسمنڈ بوپیراچی وغیرہ شامل ہیں۔

اِن محققین نے ہندوستان کی قدیم تاریخ کو اپنے آثار قدیمہ ،سکّہ جات، کتبات اور قدیم قلمی نسخوں سے ایک نئی جہت بخشی اور قدیم تاریخ کے وہ دور جن پر دُھول پڑی تھی ان کو ہندوستان کی قدیم تاریخ کے ایک خوبصورت رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ ان ہی کی بدولت تھا کہ ہندوستان کے اُن غیر ملکی قبیلوں اور خانہ بدوش لوگوں ،جنہوں نے اپنے وقت میں ہندوکش کو یاد کر کے شمال مغربی ہندوستان میں یکے بعد دیگرے اپنی سلطنتیں قائم کر دی،اُن کی تاریخ کو ایک مثبت شکل دے دی۔اِن قبیلوں میں خاص کر ہند یونانی، ہند سیتھن اور ہند پارتھین کے دور آتے ہیں یہ ادوار تقریباً دو پچاس قبل مسیح سے لے کر ایک سو عیسوی تک کا دور آتا ہے، جو تقریباً تین سو یا اڑھائی سو برس کا زمانہ آتا ہے۔

(جاری)

☆☆☆

☆......عطا محمد میر

کشمیری اور پیر پنچال پہاڑ

مورخ کلہن پنڈت راج ترنگنی میں لکھتے ہیں کہ

''کیلاش دُنیا کی بہترین جگہ ہے، اگر چہ ہمالیہ اس کا خوبصورت حصہ ہے، لیکن کشمیر ہمالیہ کی افضل ترین جگہ ہے''۔

پیر پنچال پہاڑی سلسلہ اسی ہمالیہ کی ایک وہ ذیلی شاخ ہے، جس نے ایک ارضیاتی دور میں اُبھر کر وادی کشمیر کو نہ صرف ایک خوبصورت ساخت بخشی بلکہ تب سے آج تک اس پر ایک طرح سے سایہ افگن بھی ہے۔ شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف درانتی نما اس خوبصورت پہاڑی دیوار جس کے بیچ میں رومش تھونگ یعنی Sunset Peak ہے، نے جیسے لگتا ہے کہ وادی کو اپنی گود میں لے رکھا ہے۔ اسی پہاڑی سلسلے کو کئی اُونچے درّے High Passes کئی جگہوں پر چیرتے ہیں، جن میں پیر پنچال کا درّہ تو قدیم زمانے سے رہ نوردوں کا آمد و رفت کے نکتہ نظر سے ایک خاص پڑاوَ رہا ہے۔ لفظ ''پیر'' کی وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو، اس سے قطع نظر یہ لفظ کشمیر میں ہر اُس شخص کے نام سے جڑ جاتا ہے، جو عادات و اطوار میں درویش صفت، خدا دوست، نیک اور پارسا ہو، یا جس نے دنیاوی زندگی پر اُخروی زندگی کو ترجیح دی ہو۔ کشمیر میں لفظ ''پنچال'' یا ''پانژال'' عام طور پر پہاڑ کی کسی چوٹی، درّے یا Watershed Ridge کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ والٹر لارنس کے مطابق ''پیر'' ایک ڈوگری لفظ ہے جو پہاڑ کی چوٹی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مگر ''پانژال'' ایک

کشمیری لفظ ہے جو عام طور پر اُس Crest of the mountain کیلئے استعمال ہوتا ہے، جہاں پر ایک رہگزر والا درّہ بھی ہو۔ اس کو ہم پہاڑی Corridor بھی کہہ سکتے ہیں۔ کشمیری کسی فربہ کالے کوّے Dark billed crow کو ''پانژِل کاوٗ'' کہتے ہیں، یعنی پیر پنچال پہاڑ سے آیا ہوا کوّا۔ اس طرح یہ اُن کیلئے ایک Alien Bird یا غیر مقامی پرندہ ہونے کے ناطے قابل نفرت بھی رہا ہے اور بدشگونی کا باعث بھی۔ حالانکہ یہ ماحول دوست پرندہ خیال کیا جاتا ہے، ہر چند کہ یہ ہر وقت کائیں کائیں کرتا رہتا ہے۔ کشمیر میں موسم سرما کی شروعات ایک طرح سے پیر پنچال پر برف باری ہی سے شروع ہوتی ہے۔

ایف ڈریو Frederic Drew کشمیر سے متعلق اپنی قاموس نما کتاب Jammu and Kashmir Territories میں لکھتے ہیں:

> Pir in Persian means first, or an old man, and thence a saint or faqir.

حقیقت میں پیر پنچال پہاڑ کے درّے زمانہ قدیم سے وادیٔ کشمیر میں داخل ہونے کیلئے نہ صرف تاجروں، تذکرہ نگاروں، مہم جوؤں اور حکمرانوں کیلئے شارع عام High altitude through fare جیسے رہے ہیں بلکہ اس کے مُتصل کی کئی وادیاں عبادت گزاروں، صوفی سنتوں کیلئے مراقبہ Meditation اور استغراق کی بھی جگہیں رہی ہیں۔ اسی تناظر میں ایف ڈریو لکھتے ہیں:

> ... when any noted holy faqir died on a pass, the place became sacred to his memory, and was often called after him;

مارین ڈاگمٹی اپنی کتاب Afoot Through The Kashmir Valleys میں پیر پنچال پہاڑ اوراس کے درّوں کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھتی ہیں۔اُن کے مطابق

> 'To the south is the Pir Panjal, named from the Dogri and Kashmiri words from peaks, "Poi" and "Pantsal"..... each Pir (peak) the centre of innumerable stories and traditions, half worshipped by the country folk for its size and aloofness,'

''پیر'' جو سادہ زندگی اور بلند خیالی (Simple living,high thinking) میں یقین رکھتے تھے۔ پہاڑوں کو عبور کرتے ہوئے کبھی کبھی شب گرفتہ بھی ہو جاتے تھے،اس طرح ''درّہ پیر'' "Saint Pass" رفتہ رفتہ پیر پنچال درّہ (11,400 ft.) کے نام سے مشہور ہوا۔ دوسرے معنوں میں یہ درّہ کسی نامعلوم درویش کے نام سے منسوب ہوا جو بقول فرانکولیس برنیر Francois Bernier وہاں مغل بادشاہ جہانگیر کے دورِحکومت (1605-1628 AD) میں رہتا تھا۔عام کشمیری اس کو آج ''پیر کی گلی'' کہتے ہیں،جس کے معنی ہیں "Pir's Corridor" پیر پنچال پہاڑ نہ صرف کشمیر وادی کو بیرونی میدانوں اوراس کے ملحقہ شوالک پہاڑوں سے الگ کرتا ہے بلکہ کریوا پہاڑوں یا Foothills پر سایہ افگن ہوتے ہوئے ساٹھ، ستر کلومیٹر کھلی وہ پہاڑی دیوار یا پٹی بھی بناتا ہے جو ماہر طبقات الارض کے مطابق

طشتری نما وادیٔ کشمیر کا اصل خالق ہے، یا یہ اسی کی Creation ہے۔

پیر پنچال پہاڑ کے درّے کشمیر کی تاریخ کی کتاب کے جیسے بکھرے ہوئے وہ صفحے ہیں، جن پر وقت نے دُکھ، درد وغم، تلخ وتند اور خوفناک کہانیاں تحریر کی ہیں۔ اس پر نہ مٹنے والی سیاہی سے حملہ آوروں، غاصبوں اور زور زبردستی کرنے والوں کے بارے میں وہ طویل مضامین تحریر ہیں جن کا تعلق براہ راست معصوم وسادہ کشمیریوں سے ہے۔ اگر چہ یہ درّے جو اپنی فطرت میں ''پیر'' ہیں اور اس طرح اُنہوں نے کئی دفعہ کئی دراندازوں اور بدطینت حملہ آوروں کا راستہ روک لیا۔

محمود غزنوی (997-1034 AD) جو افغانستان کا ایک جنگ آزمودہ بادشاہ تھا، نے 1015ء اور 1021ء میں وادی کشمیر میں اپنے لشکر کے ساتھ داخل ہونا چاہا مگر پیر صفت پیر پنچال کی نوک دار چوٹیوں، سنگستانی پگڈنڈیوں اور پہاڑوں کے بدلتے موسموں نے اُس کا خواب، خواب ہی تک محدود کیا۔ اس طرح وہ کئی بار دور سے پیر پنچال درّے کو دیکھ کر ہی واپس چلا گیا۔ ابوریحان البیرونی جو اُس کا درباری مورخ تھا، اور اُس کے ہمراہ ادھر کا رخ کیا، محمود غزنوی کی آدھے راستے سے واپس جانے کی بات کرتے ہوئے لکھتا کہ کشمیری قدرت کے بنائے ہوئے ایک قلعے میں رہتے ہیں۔ اُن کے پہاڑوں کے درّے اُن کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی اس طرح کی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ ان درّوں کی خود نگرانی کرتے ہیں۔ مغل بادشاہ اکبر کے فوجی اپنی تیسری کوشش (1585-86 AD) میں بھی کشمیر کو فتح کرنے میں ناکام ہو جاتے یا دوسرے معنوں پیر پنچال درّے اُنہیں وہیں کہیں درماندہ کر کے Retreat سے ہم کنار کرتے اگر گھر کے بھیدی لنکا ڈھانے والے لوگ اُن کی مدد نہیں کرتے۔ اُس کا شاہی مورخ ابواُلفضل اس کا اعتراف کر کے لکھتا ہے کہ کشمیر جانے والے درّے اور پہاڑی راستے مُنظّم فوجیوں کے دستوں کی بھی راہ

روک سکتے ہیں اور یہ کہ کشمیری آسانی سے حملہ آوروں کو پہاڑی درّوں میں شکست سے دوچار کر سکتے ہیں اگر اُنہیں بروقت ایسے دراندازوں کے بارے میں اطلاع ہو جائے۔ اکبر اگر چہ 1589ء میں بذات خود Men اور Money کے باعث بھاری فوجی جمعیت کے ساتھ کشمیر میں داخل ہوا، مگر وہ وہاں بال بال بچ گیا، جب پیر خصلت درّہ پیر پنچال کو عبور کرتے ہوئے گھوڑے سے گر پڑا۔ اسی کے مدنظر بعد کے ادوار میں پیر پنچال درّے کے آس پاس کئی سرائیں بھی تعمیر ہوئیں اور راستے کے رکھ رکھاؤ کیلئے بھاری رقومات بھی مغلوں نے خرچ کئے۔ اس طرح پھر اکبر بادشاہ کے بعد جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کیلئے کشمیر کا سفر کرنا قدرے آسان ہوا۔ ایک برطانوی مُصنفہ پی پائیری نے اپنے سفر نامے Kashmir the Land of Streams and Solititudes میں اس پہاڑی راستے کو اسی تناظر میں The Road of the Emperors کا نام دیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> "The splendid serais of the Pir Panjal route were mostly built by a Moghul viceroy, Ali Mardan Khan, who spend a lot of money on his journey to Kashmir, and who had such a magnificient way of doing things that he was supposed to possess the philosopher's stone."

نوکیلی پہاڑی چوٹیوں، غیر دوستانہ پہاڑی راستے اور لحمہ لحمہ بدلتے موسم کا بس خیال کرتے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ (1841-1799) نے کشمیر آنے کا اپنا خیال ترک کیا، ہر چند کہ اُس کے فوجی، دیوان چند اور مہاراجہ گلاب سنگھ کی سرکردگی میں

1814ء میں ان پہاڑوں کو عبور کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کبھی بھی کشمیر نہیں آئے۔

ایک منگول یا تارتر غارت گر زولقدر خان Nicknamed as Zoolchu اپنے لوٹ مار کی مہم میں 1320ء میں پیر پنچال پہاڑ کو عبور کرنے میں کامیاب ہوا۔ ایک فراری حکمران کی طرح اُس نے آٹھ ماہ کے اندر وادی میں بے شمار بچوں عورتوں اور مردوں کو مار ڈالا۔ مگر جب وہ واپس چلا گیا تو برق و باراں اور برف باری نے اُسے پیر پنچال کے ہی ایک درّے کلی نارواوَ نے اپنے فوجیوں اور کشمیری مزدوروں جو اُس نے جبراً اپنے ساتھ لئے تھے، ہلاک کر دیا۔ والٹر لارنس لکھتے ہیں:

> "... tried to get out of Kashmir by the passes leading from the south through the Kuli Narawao Valley, but snow overtook him, and he and his army and his Kashmiri captives perished".

پیر پنچال پہاڑی درّے نے ایک طرح سے اُس وقت اپنی ناراضگی ظاہر کی جب اُس نے 515ء میں ایک ظالم سفاک اور خوں خوار ہُن بادشاہ مُہر ہ کل کو وادی کشمیر کی طرف گزرتے دیکھا۔ مہرہ کل شاید یہاں Mountain Sickness کا شکار ہوا اور ذہنی توازن کھو بیٹھا کہ اس حالت میں اُس نے اپنے ہاتھیوں کی ٹانگیں رسیوں سے باندھ کر ڈھلوانوں کی طرف تربوزوں کی طرح دھکیلنے کا حکم دیا، اس طرح چھنگاڑتے اور مرتے ہوئے ہاتھیوں کی چیخیں سن کر وہ قدرے خوش ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کے ہونٹ عمر بھر مسکراہٹ سے محروم رہے اور بس اسی دن وہ ہنس پڑا جب

اچانک ایک ہاتھی ازخود گہرے نالے میں گرتے ہوئے مر گیا۔وادی میں داخل تو ہوا تو وہاں بھی ہزار ہا لوگوں کو قتل بھی کیا، مگر بالآخر وہاں ہی خود کو زندہ جلا کر خودکشی کی۔ S. Luckvinder Singh کے مصنف Ancient Kashmir Sodhi لکھتے ہیں:

> " While crossing the Pir Panjal pass, an elephant missed his foot and tumbled down a pricepice. Its shrieks and yells while rolling down pleased the ears of this mad king and he ordered 100 more elephants to be pushed down the precipice, just to amuse himself ".

کشمیری نمک کے رسیا ہیں اور اپنے کھانے پینے کی اشیا کو نمک آمیز دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ کشمیر کے پہاڑوں میں نمک نہیں ہوتا۔ یہ یہاں ایک درآمدی شے ہے جو صدیوں سے پیر پنچال درّے سے بیرونی خطوں سے لائی جاتی تھی۔اس وجہ سے یہ پہاڑی گزرگاہ ''نونہ وَتھ'' یعنی شہراہ نمک (Salt Road) کے نام سے بھی جانی جاتی تھی، کشمیری جو اچھے رہ نورد تھے،اسی راستے اکثر تجارتی سفر بھی کرتے تھے۔ مغل حکمرانوں نے اپنے مقاصد کیلئے اس کی طرف زیادہ توجہ دی اور اس کی مرمت، رکھ رکھاؤ اور کشادگی کے علاوہ اس کے کئی مقامات پر سرائیں بھی تعمیر کیں تا کہ مغل گورنروں، اُن کے اہلکاروں اور مغل بادشاہوں کا کشمیر کا سفر آسان ہو جائے، جو اکثر موسم گرما میں کشمیر کی قدرتی خوبصورتی اور خوشگوار موسم کا لطف اُٹھانے کیلئے آتے تھے۔ اس طرح کشمیریوں کی ''نونہ وَتھ'' مغل روڈ بن گئی۔ ابوُالفضل کی تحریروں کا

مطالعہ بتاتا ہے کہ مغل اصل میں اپنے اُن درباری شاعروں کے کلام سے متاثر ہوئے، جن میں اُنہوں نے کشمیر کی خوبصورتی کا ذکر حسین ترین اشعار میں کیا تھا اور یہی اشعار کشمیر میں مغل حکمرانی کا باعث بنے۔ وہ آئے اور یہاں اپنے لئے باغ تعمیر کئے۔ اُنہوں نے اس کو جنت قرار دیا اور اس طرح اپنی بیگمات، حواریوں، درباریوں یعنی صحیح معنوں میں لاؤ ولشکر کے ساتھ یہاں Merry-Making میں اپنا بیشتر وقت صرف کیا۔ ان سب کو پیر پنچال درّے نے کم و بیش ایک سو پچاس سالوں تک آتے جاتے دیکھا۔

اگر چہ کشمیری عام طور پر درّہ پیر پنچال کو باہری خطوں سے نمک لانے کیلئے عبور کرتے تھے، مگر تاریخ کے کئی موقعوں پر کشمیر کے ہی کچھ غیر مطمئن عناصر اور موقع پرستوں نے باہری خطوں میں زیادہ نمک کھانے کی خواہش کو پورا کرنے کیلئے خاموشی سے 'نُنہ وَتھ' یعنی پیر پنچال درّے کو عبور کیا۔ اس خواہش نے اُنہیں لالچی بنایا۔ اُنہوں نے یہ نہیں سوچا کہ A pinch of salt is enough نمک کے ایک انبار کی ضرورت نہیں کہ اس کے بوجھ تلے انسان دب سکتا ہے۔ ایسے لوگوں نے اگر چہ اچھا خاصا نمک چکھ لیا، مگر نمک والے آقاؤں نے اُنہیں ہمیشہ نمک حرام کی حیثیت سے دیکھا اور پیر پنچال (نونہ وَتھ) درّے نے بھی اُنہیں بالاخر ردی کی ٹوکری میں دیکھا۔

کشمیری مذاق پسند لوگ ہیں۔ وہ ہر اچھی بری چیز کا مذاق اُڑا کر ہنستے ہیں اور ایک گونہ مسرت پاتے ہیں۔ نمک حراموں کے بارے میں کشمیری زبان وادب میں کئی ضرب المثل ملتے ہیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں، ''نُو نہ پھوّل ہاوُن'' 'یعنی کسی کو نمک کا ڈھیلہ دکھا کر للچانا' اور ''بستَن نُون سارُن'' 'یعنی' کھال کے اُس ٹھیلے میں نمک بھر کر لے جانا، جو اُسی کی کھال اُدھیڑ کر بنائی گئی ہو، جس کو پہلے نمک کا ڈھیلہ دکھا کر ورغلایا گیا ہو۔ شخصی حکومتوں کے دور میں کشمیریوں پر بہت ٹیکس نقد وجنس عائد کئے گئے۔ ان

کی وصول یابی جی ایل کول کی کتاب کے مطابق تحصیل دار، تھانیدار، کاردار، مقدم ، پٹواری، شک در، شرگول، ہرکار اور ڈوم کے ذریعہ کی جاتی تھی۔

جی۔ایل کول اپنی کتاب Kashmir Through The Ages میں لکھتے ہیں:

''یہ لوگ اکثر ٹیکس وصولی میں تندمزاج ہوا کرتے تھے۔مگر غربت کی وجہ سے سماج کے کئی طبقے ٹیکس ادا نہیں کر سکتے تھے۔ان میں ایک طبقہ شالبافوں کا تھا۔اُنہوں نے ان ٹیکسوں کے خلاف احتجاج بھی کیا مگر شنوائی نہیں ہوئی۔نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہوں نے کام کرنا ہی بند کیا، یعنی کام چھوڑ ہڑتال کی۔اس طرح وہ بھکمری کا بھی شکار ہونا شروع ہوئے اور عتاب کا بھی۔ ان حالات میں بہت سے شالباف اپنے اہل عیال، عزیز و اقارب کو پیچھے چھوڑ کر پیر پنچال درّے کو عبور کر کے پنجاب بھاگ گئے۔ جہاں اُن دنوں انگریز حکومت کر رہے تھے۔لیکن پیر پنچال درّے کو عبور کرتے ہوئے ہزار ہا شالباف بھوک، تھکن اور موسموں کی مار کے باعث مر گئے۔اس طرح چیل کوؤں اور گدھ کا شکار بنے۔جو صحیح سلامت بیرونی خطوں تک پہنچے وہ بھی واپس نہیں لوٹے۔اگر چہ گھر کی یاد دہائیوں تک اُن کے ذہن و قلب پر ہتھوڑے برساتی رہی۔''

اُن دنوں پیر پنچال پہاڑ عبور کر کے پنجاب بھاگ جانا کوئی آسان سفر نہ تھا یہ ایک پہاڑی پگڈنڈی تھی اور راستے میں کوئی پناہ گاہ بھی نہیں تھی۔دوسرے یہ کہ اس طرح سے وادی سے بھاگ جانا ایک جُرم تھا، پکڑے جانے پر سخت سزا دی جاتی تھی۔

اس طرح پیر پنچال درّے نے دہائیوں تک کشمیریوں کو خوف، بھوک اور بے چارگی کا یہ سفر طے کرتے ہوئے بھی دیکھا اور کسمپرسی کی حالت میں دم توڑتے بھی۔ کشمیر سے شالباف ہی نہیں بھاگے بلکہ بہت سے وہ زمیندار بھی راہ فرار اختیار کر گئے جو بیگار سے بچنا چاہتے تھے۔

ولیم مور کرافٹ 23-1822ء میں لکھتے ہیں:

''میں نے پیر پنچال کے دشوار گزار درّے کو پار کرتے ہوئے 54 مزدوروں کی لاشیں خود دیکھی ہیں، جن کا کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔ ان وارداتوں کے پیچھے دو اہم وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ کھانے کو بہت کم ملتا تھا۔ دوم یہ کہ تن ڈھاپنے اور ٹھٹرتی سردیوں سے بچنے کیلئے اُن کے پاس پہناوا نہیں ہوتا تھا۔ روزگار کیلئے ہجرت تب ہی کی جاتی تھی، جب اس جان لیوا سفر پر جانے والا کشمیری مزدور ارباب اقتدار سے یہ سند ساتھ رکھتا کہ اُس نے سبھی ٹیکس ادا کئے ہیں۔

(ولیم مور کرافٹ 23-1822 اشیرازہ جلد 42)

مغل بادشاہ جہانگیر (1638-1605) جس نے درّہ پیر پنچال پر ہی زندگی کی آخری سانس لی۔ وہ آٹھ مرتبہ کشمیر آیا۔ جب اُس نے پہلی مرتبہ گلمرگ کی سیر کی، تو وہاں پھول گننے لگا اور گنتے گنتے سب کچھ بھول گیا۔ ایک ایسے سفر میں جہانگیر کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ:

"He ordered his personal attendants, both horse and foot to bind bunches of the flowers in their turbans, and he ordered

that the turbans of those who would not decorate themselves in this fashion should be taken off their heads. He thus got up a fine moving garden of flowers."

فرانسیس ینگ ہسبنڈ نے اپنی کتاب Kashmir کے ایک تہائی صفحات کشمیر کے پھولوں کی تعریف کی نذر کئے ہیں۔ اُن کے مطابق یہاں اتنے اقسام کے پھول ہیں کہ اُن کا کوئی نام بھی نہیں۔ اسی طرح مارین ڈاگٹی اپنی کتاب A Foot Through the Kashmir Valley. میں لکھتی ہیں:

"It is a world of roses. May be people at home think they know what this mean, I am sorry for them; they are mistaken.I have seen wild and garden roses in many places, as I thought, in vast quantities, but a land clothed in roses, I did not know, they were in millions."

پیر پنچال پہاڑ کی سنگستانی اور برف پوش چوٹیاں آسمان کی طرف دُعا گو نظر آتی ہیں کہ اُن کے یہاں نہ نمک (Salt) ہے اور نہ ہی شورہ Saltpetre۔ یہ بس برف کی ہی آماجگاہ ہے۔ وہ جب بھی بادلوں سے بغل گیر ہوتے ہیں تو بہت سارا پانی بارشوں کی صورت میں پیتے ہیں۔ جب پانی سے شرابور ہوتے ہیں تو آس پاس وہاں بے شمار خوشبودار پھول کھلتے ہیں۔ اُن ہی پھولوں میں ایک پھول کو کشمیری میں ''نونہِ پوش''، یعنی نمک کا پھول کہتے ہیں۔ فارسی زبان میں اس کو گل بنفشہ کہتے ہیں اور

نباتاتی زبان یہ Viola odorata perpens کہلاتا ہے۔کشمیری اصل میں گل فروش رہے ہیں۔ پھولوں کے درمیان رہتے ہوئے وہ نمک کو پسند کرتے ہیں کہ اُن کی ساگ سبزیوں کو مزیدار تو بناتا ہی ہے، اُن کے اس پسندیدہ مشروب ''چائے'' کو اور زیادہ لذیز بناتا ہے، جو وہ صبح وشام پیتے ہیں۔کھانڈ اُن کیلئے ایک عیاشی ہے مگر نمک ایک ضرورت۔والٹر لارنس لکھتے ہیں:

> "Salt is an important article of diet both for men and cattle and sheep. The Kashmiris like thier food very salty".

پرانے زمانے سے نمک کشمیریوں کے کاروبار کا ایک اہم جُز رہا ہے۔ پیر پنچال پہاڑ کو عبور کرنے والے ایسے بیوپاریوں کی وہ راہ دیکھ رہے ہوتے تھے۔ یہ بیوپاری وہاں غیر منقسم پنجاب میں اُن بیوپاریوں سے خریدتے تھے، جن کو ''بنیا'' Bunya کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ کاروبار کے گُر جانتے تھے اور نفع ونقصان سے آگاہ تھے، یعنی وہ True to their bargain تھے۔وہ جانتے تھے کہ نمک کشمیریوں کی من پسند چیز ہے لہٰذا منہ مانگی قیمت پر بیچتے تھے۔اُن دنوں پنجاب میں گُل بُنفشہ کی بڑی مانگ ہوا کرتی تھی کہ اس کو وہاں کے حکیم دوائی کے طور پر Prescrible کرتے تھے۔ بنیا نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا اور کشمیریوں کو اسی پھول کے بدلے نمک بیچنے کی اجارہ داری شروع کی۔اس طرح کشمیری گل فروشوں کو گل بنفشہ کے ایک انبار کے بدلے میں کوہستانی نمک کے کچھ ڈھیلے دیئے جاتے تھے۔رفتہ رفتہ گل بنفشہ کا نام ''نونہ پوش'' ہوا یعنی وہ پھول جس کے عوض نمک ملتا ہے۔وہ لوگ کوہستانی نمک بیچنے لگے اور ہم گل بنفشہ یا ''نونہ پوش'' اُنہیں فروخت کرتے رہے۔اس طرح کا استحصالی کاروبار بھی پیر پنچال درّے نے دہائیوں تک دیکھا۔ یہ پتھروں کے بدلے

چاندی بیچنا جیسا کاروبار تھا۔ اقتصادیات کے اصول بتاتے ہیں، کہ کسی چیز کی فراہمی، مانگ اور مقدار اُس کی قیمت متعین کرتے ہیں۔ اگر کوئی چیز ضروریات Necessity کی فہرست میں ہوتو یہ اُس کو اور بھی مہنگا کرتا ہے۔ دوسرے معنوں میں چیزوں کی Supply اور Demand کے حساب سے اُس کی قیمت میں اتار چڑھاو ہوتا رہتا ہے۔ کئی معنوں میں خریدنے والا Consumer بادشاہ تصور نہیں ہوتا۔ وہ چیزیں بیچنے والوں کے رحم و کرم پر بھی ہوتا ہے۔ نمک کشمیریوں کیلئے ضروریات Necessity کی فہرست میں تھا اور پنجاب کے بنیئے یا بیوپاری اس کی مصنوعی قلت پیدا کر کے قیمت بڑھانے میں خود کو حق بجانب ہونے کا عندیہ دیتے تھے۔ ان حالات میں گل بنفشہ تو دور کی بات کشمیری ''سُنہری پھول'' یعنی زعفران کی پتیوں کے بدلے نمک خریدنے پر بھی مجبور ہو جاتے تھے۔ محمد دین فوقؔ کی ''تاریخ کشمیر'' کے مطابق کشمیری مہاراجاؤں کے دور میں زعفران کے پھول وزن کے حساب سے گھر لے جاتے تھے اور اُن پھولوں سے زعفران کی پتیاں نکال کر واپس لا کر ان کے عوض نمک بطور مزدوری حاصل کرتے تھے۔ تزک جہانگیری (صفحہ نمبر 177 جلد 2) کے مطابق زعفران کے پھول زمینداروں اور حکومت کے درمیان تقسیم ہوتی تھیں، مگر کشمیری زمیندار اس کے بدلے نمک حاصل کرتے تھے۔ کشمیری اگر چہ مبادلہ Truck System سے صدیوں سے متعارف بھی تھے اور واقف بھی، مگر پیر پنچال درّے پر اس سلسلے سے متعلق استحصال کی لاتعداد کہانیاں لکھی ہوئی ہیں۔ جب برصغیر تقسیم ہوا (1947 AD) تو شاہراہ نمک بھی متاثر ہوئی اور کشمیر قحط نمک Salt Famine کے ایک ایسے دور سے گزرا جب واقعی لوگوں نے سونے کی قیمت میں نمک خریدنا چاہا، مگر نہ ملا۔ ہر چند کہ بعد کے ایام میں اُنہیں سمندری نمک باافراط دستیاب رہا۔

☆☆☆

☆......عبدالخالق شمس

کشمیر کی تاریخ کے مغالطے

مبالغہ آرائی قصہ گوئی کا خاصہ ہے۔ تاریخ ایسی چیزوں سے عاری ہو تو بہتر ہے۔ اقوامِ عالم کی تاریخیں مبالغوں اور مغالطّوں سے لبریز ہیں۔ کشمیر کی قدیم تاریخ اِن سے چنداں الگ نہیں۔ منظوم صورت میں رقم ہونے کی بنا پر اس میں شاعرانہ ابہام وتعلیات کی بھرمار ہے۔ ہم اسے خالص تاریخ تسلیم کرنے میں کچھ اس طرح سے متفق ومُنتشر ہیں کہ جیسے سوکھے گھاس کے بے ترتیب انبار میں سونے کی سوئی تلاش کر رہے ہیں۔ میں نے قدیم تاریخ کی ان شاعرانہ تعلیوں کی طویل فہرست مرتب کی ہے لیکن وقت کی تنگ دامنی کی بنا پر اُن تمام کا خلاصہ قطعی ناممکن ہے، تاہم چند ایک کا تذکرہ موضوع کے اعتبار سے ناگزیر ہے۔ اس سلسلے میں ہم سب سے قبل کشمیری تاریخ کے اُس نقطہ آغاز کو کھوجیں گے جب سے اِس خطۂ آب یاب پر بادشاہی کا آغاز ہوتا ہے۔ قدیم کتبِ تاریخ میں یہ آغاز نواسی (۷۹) قبل کل جگ درج ہے جس کو عیسوی میں تبدیل کر کے مورخین نے 3180 قبل مسیح کا زمانہ کہا ہے لیکن اِسی زمانے کے آس پاس وہ عالم گیر طوفان بھی برپا ہوا ہے، جس کی شہادتیں روم و یونان، مصر و ملایا، سندھ و ہند اور جزائر کی لوک ریوایات، عقیدتی دستاویزات اور ارضیاتی ماہرین کی روداد میں آج بھی موجود ہیں، جن کی موجودگی میں اِس زمانے کے آس پاس وادی یا کشمیر پر بادشاہت کا آغاز دکھانا عقلی طور پر مضحکہ خیز ہے۔ چونکہ یہی زمانہ ہماری تاریخ کے مندرجات کے مطابق جنگِ مہابھارت کا بھی مذکور ہے جس میں کشمیر کے اوّلین

''راجہ اوکنند'' کرشن جی کے بھائی بلیدر کے ہاتھوں مارے گئے۔ لہٰذا میں جنگِ مہابھارت کو صحیح تاریخ سے متعلق گوگل کے دروازے کریدتا رہا، جہاں سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ اس دوران بعض ہندو دوستوں سے استفسار کرنے پر مجھے کچھ زیادہ ہی مایوسی ہوئی کیونکہ وہاں اکثریت اِسے آسمانوں میں دیوتاؤں کے درمیان رونما ہونے والی جنگ کہا جاتا ہے۔ کئی دوستوں نے واضح طور پر کہا کہ عملاً ایسی کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک افسانوی جنگ ہے وغیرہ وغیرہ۔ عنوان بدل بدل کر گوگل پر چند ریسرچ پیپرز کا بھی مطالعہ کیا۔ ایک روز ایک مراٹھی اسکالر ڈاکٹر پی۔ وی۔ واٹیک کی کتاب The Scientific Dating of Mahabharata War پڑھنے کو ملی۔ اِس کتاب میں جنگِ مہابھارت پر ایک سیر حاصل سائنسی اور عقلی بحث کے بعد مذکورہ اسکالر اس کی اصل تاریخ اٹھارہ طریقوں سے 16 اکتوبر 5561 قبل مسیح ثابت کرتے ہیں۔ مذکورہ اسکالر ہندو عقائد سے وابستہ علوم میں غیر معمولی صلاحیتوں سے مالا مال ہونے کی بنا پر پوری برادری میں گُرو کے طور پر مانے جاتے ہیں جو اُن کا موروثی پیشہ بھی ہے۔ اس طرح سے جب مجھے اس تحقیق کے حوالے سے مصنف کے بارے میں پوری جانکاری ملی تو معلوم ہوا کہ ہندی اور سنسکرت زبان میں شاعری، ساہتیہ، ریاضی، نجوم، شاستر، طب اور اتہاس کے یہ باصلاحیت مراٹھی اسکالر ہندی، انگریزی اور سنسکرت زبان میں ''ہندو عقائد کی سائنسی تحقیق کے موضوع پر 2017ء تک ایک سو دس کتابیں شایع کر چکے تھے اور زیرِ بحث تحقیق اُس سنسکرت اشلوک کے عین مطابق ہے جو جنگِ مہابھارت کے صحیح تاریخ سے متعلق ہندو دُنیا میں معتبر تاریخ کے طور پر مانا جاتا ہے۔ دراصل آئے ہول کرناٹک کے جین مندر کے ایک ستون پر کسی سنسکرت شاعر کے اُس مندر سے متعلق تاریخ سنگِ بنیاد سے جنگ مہابھارت کی صحیح تاریخ برآمد ہوتی رہی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اشلوک کے چند الفاظ وزن شعر کے طور پر غیر ضروری

تصور ہوکر نظر انداز کئے جاتے تھے۔ واٹیک موصوف نے سترہ طریقوں سے 16 اکتوبر 5561 قبل مسیح کو جب اس اشلوک کے اُن الفاظ سے ملایا جن سے آج تک یہ تاریخ نکالی جاتی رہی تو یہ غلط ثابت ہوئی۔ پھر جب اُنہوں نے غیر ضروری خیال کئے جانے کے بعد نظر انداز کئے گئے الفاظ اِس پر جمع کئے تو یہ اٹھارہویں طریقے سے بھی یہی 16 اکتوبر 5561 قبل مسیح برآمد ہوا۔ واٹیک موصوف کو بعد میں اِن تحقیقات کی کامیابی کے لئے ہندو اسکالر نے کئی عالمی سطح کے سیمیناروں میں تمغوں اور اعزازات سے بھی نوازا۔ لہٰذا اس تحقیق کو آپ کہ ہندو برادری اور ہندو عقائد کے دائروں میں قبول عام حاصل ہوا ہے۔ کشمیر کی تاریخ کے بہت سے مغالطّوں کا ازالہ کرنا بھی آسان ہوگیا ہے جس کی روشنی میں اب وہ آغازِ بادشاہت 5637 قبل مسیح درج ہونا لازمی ہے جو ہماری تاریخوں میں آج 3180 قبل مسیح درج تھا یا درج ہے۔ اِس طریقے سے ہمارے پاس 7660 سال سے لکھی ہوئی تاریخ موجود ہے، باوصف اس حقیقت کے کہ بعض راجوں کی معلومات تب بھی تحقیق طلب تھیں اور آج بھی تحقیق طلب ہیں جو ویسے بھی ہمارے مورخین کی کوتاہ علمی کی وجہ سے تاریخ کے ساگر کی تاریکی میں گُم ہیں۔ جیسے کہ سندیمان کے بارے میں اب سامنے آرہا ہے۔ سندیمان کے بارے میں کشمیر کی قدیم تاریخوں میں جو حلیہ، شان وشوکت اور تفصیلات مذکور ہیں وہ خوش قسمتی سے دُنیا کے حکمران پر مُنتج ہی نہیں ہوتے ماسوائے شاہ سلمان کے۔ معلوم نہیں کہ کشمیر کے مورخ کو نام یا الفاظ بدلنے یا بگاڑنے کی کون سی مجبوری رہی ہے کہ وہ امیر المومنین کو ''حمیر'' ذوالقدخان کو ''کجل'' اور شاہ سلمان کو سندیما کہتے ہیں۔ شاہ سلیمان کے بارے میں وہ زمانے کا بھی تعین نہ کر سکے۔ کیونکہ کشمیر کی تاریخوں میں اِن کا زمانہ 1282 قبل مسیح دکھایا گیا ہے۔ جبکہ عرب اور یورپی تاریخوں میں اُن کا زمانہ دسویں صدی ق م مذکور ہے۔ اس طرح سے یہاں شاہ سلیمان اپنے اصل زمانہ سے تین سو سال قبل ہی دکھائے گئے ہیں۔ کشمیر کی قدیم تاریخ

کے حوالے سے اِس واقعہ کے اور بھی پہلو ہیں مثلاً شاہ سند یمان کی آمد راجہ دامودر کو راجہ بنائے جانے کے تیرا روز بعد مذکور ہے جس وقت کشمیر پر دامودر کے پسر راجہ نر حکومت کر رہا تھا لیکن جب وہ سند یمان کے ساتھ مغرب کی جانب چلے گئے تو سلیمان نے یہاں پر حکومت کرنے کی غرض سے اپنے تین ساتھی ترک شاہزادے چھوڑ دیئے۔ کشمیری مورخ یہاں پر اُن تین شہزادوں کی جگہ ہشک ،زشک ،اور کنشک کے نام اور حالات درج کرتا ہے جو کہ خلافِ حقائق ہے کیونکہ ہشک ،زشک ،اور کنشک ترک شاہزادے نہیں بلکہ کُشان خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وہ دسویں صدی ق م کے شاہ سلمان کے ساتھی نہیں بلکہ پانچویں یا تیسری صدی کے گوتم بدھ کے پیروکار تھے۔ اُنہوں نے ترک شاہزادوں کے برعکس یکے بعد دیگرے حکومت کرنے کی بجائے ایک ساتھ حکومت کی ہے اور اُن کا زمانہ 1282 ق م نہیں بلکہ 128 عیسوی کا درمیانی زمانہ ہے۔ لہٰذا ان شکوک کی دُھند میں یہ سوال قدیم مورخین کے سامنے پھر کھڑا ہے کہ وہ ترک شہزادے کہاں گئے جنہوں نے شاہ سلیمان کی جانب سے یکے بعد دیگرے کئے سوسال تک حکومت کی؟ جبکہ دوسری جانب کشمیری مورخ مہابھارت کی تاریخ غلط ہونے سے وقت کی تنگ دامنی کے باوجود تین سوسال تک ایک ہی فرد کو کشمیر کی گدی پر دکھاتا ہے اور اسی زمانے کے آس پاس ایک بادشاہ کو اپنے لاولد والد کا پسر کہہ کر اُس کے وفات کے 184 سال بعد تخت پر دکھاتا ہے بلکہ آری رائے نام کے وزیر کو پھانسی پر جان دینے کے کئی روز بعد جب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، اسے نئے سرے سے زندہ ہونے کی بات کر کے کئی دہائیوں تک حکومت کے تخت پر دکھاتا ہے۔

ہم اب اپنی تاریخ کے ایک اور مغالطے کی جانب آپ کی توجہ مبذول کریں گے جو اِس خطہ کشمیر پر انسانی رہایش کے نقطہ آغاز سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں ہماری تاریخوں میں واضح طور پر درج ہے کہ یہ پوری وادی ایک بڑی جھیل تھی۔ جس کی

گہرائیوں میں ایک سفاک آبی مخلوق جل بھود یو یعنی ''آبِ جن'' مقیم تھا، جو ساحل پر آباد انسان کو مار کر واپس اپنی آبی پناہ گاہ میں جا کر چُھپ جاتا تھا۔ اِس سفاک کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے سورج اور نیل کے والد کشپ ریشی نے کھادن یار کے مقام پر پہاڑ توڑا، جس سے جھیل پانی سے خالی ہوگئی۔ جل بھود یو پکڑ میں آیا اور مارا گیا۔

اس سلسلے میں ماہرین اراضیات کے بیان واضح ہیں کہ ایک زمانے میں پوری کی پوری زمین پانی ہی پانی تھی۔ زیرآب ہمیشہ سے ہی آتش فشان ابلتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ پھٹ کر دھماکوں اور زلزلوں کے موجب بن جاتے ہیں۔ سطح زمین پر ہمیشہ چھوٹی بڑی تبدیلیاں اِن ہی کی وجہ سے ہوتی رہتی ہیں۔ زمینی تحقیق سے وابستہ ماہرین کے مطابق دوسو ملین سال ایسے ہی ایک زلزلے سے آبی گلوب کے بیچوں بیچ اوپر سے نیچے تک ایک قوس کی شکل میں زمین نام کی کوئی چیز وجود میں آگئی جسے ماہرین نے پینگیہ کا نام دیا اور پسماندہ آبی گوشے کو ساگر سے موسوم کیا، اس کے پچاس ملین سال بعد پینگیہ دو حصوں میں ایسے ہی ایک زوردار زلزلے سے بٹ گیا جو لاوریسہ اور گونڈوا کے نام سے موسوم ہوگئے۔ پھر پچاس ملین سال گزرنے کے بعد ایک بار پھر شدید زلزلہ واقعہ ہوا جس سے لاوریسہ اور گونڈوانا سات حصوں میں بٹ گئے جنہیں آج ہم سات براعظموں کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے سات تا دس ملین سال بعد پھر ایسے ہی ایک عمل سے کشمیر کی زمین بھی وجود میں آگئی ہے۔ چونکہ آتش فشان اِس کے پاتال میں موروثی طور پر موجود ہیں لہٰذا یہاں بھی اکثر و بیشتر ایسے ہی زلزلے اور دھماکے بعد میں بھی ہوتے رہے جس کے نتیجے میں یہ وادی ایک بار ایک وسیع و عریض جھیل میں تبدیل ہوگئی اور مرحلہ وار پہلے جنوبی فراز پھر مشرقی اور آخر پر شمال مغربی اطراف کے فراز زمینوں کی موجودہ شکل وصورت زیرِ آب تشکیل پاتی رہی۔ اس عمل کے کئی ملین سال بعد پھر ایک ایسا زلزلہ ہوا کہ پانی کی لرزش یعنی حرکتِ آب کی شدّت سے کھادن یار کے مقام پر پہاڑ میں آج سے پچاسی ہزار برس

قبل ایک شدّید شگاف پڑ گیا جس نے دھیرے دھیرے موجود وِتھ یعنی جہلم کی شکل اختیار کی۔ اِس موقع پر کشمیری مورخ اپنی منظوم تاریخ میں جیسا کہ راج ترنگنی کے ترنگ اوّل کے شلوک 28 سے آگے اور نیل مت پوران میں شلوک 35 سے آگے یعنی 84 سے 81 تک اور 203 سے 101 تک واضح تذکرہ موجود ہے۔حتیٰ کہ اشلوک 181 کا ترجمہ ارجن دیو مجؔبور کے اُردو ترجمہ میں اس طرح سے ہے:

''جب بہترین پہاڑوں کا راجہ توڑ دیا گیا تو پانی شدّید تیزی سے بہنے لگا۔اس خطرناک بہاؤ اور اس کی آواز سے سبھی جاندار تھر تھر کانپنے لگے اور ٹیڑھی لہروں سے مانو ہمالیہ آسمان کو چھو رہا ہو۔ جب جھیل کا پانی غائب ہو رہا تھا تو پانی میں پیدا ہوئے جلودیو نے جادو شروع کر دیا۔ اس نے چاروں طرف اندھیرا پیدا کیا۔ اے انسانوں میں عظیم شخصیت، دنیا اندھیرے میں نابود ہو گئی۔ تب شِو نے اپنے دو ہاتھوں میں سورج اور چاند کو پکڑا اور آنکھ جھپکنے میں اندھیرا ختم ہوا اور ساری دنیا میں روشنی چھا گئی۔ جب اندھیرا غائب ہوا، ہری جس کو کوئی ہرا نہیں سکتا، نے یوگ کی قوّت سے دوسرا جنم اختیار کیا......''۔

اِن تاریخوں کے مطالعہ کے بعد جب ہم موجودہ نسلِ انسانی کے مورثِ اعلیٰ بابا آدم کا زمانہ تلاش کرتے ہیں تو وہ معقول اور سائنسی تحقیق سے نو دس ہزار سال سے زیادہ پرانا معلوم نہیں ہوتا ہے اور اگر تمام پشتوں کی عمر میں بھی ریاضی کی طرح پر جمع کریں اور عُور لیپنگ کا زمانہ نظر انداز بھی کریں، تب بھی یہ زمانہ بارہ تیرہ ہزار سال سے اوپر نہیں جاتا ہے۔ اگرچہ عقائد اور تھیوریز کی موجودگی میں ہم اُسے لاکھوں کروڑوں برس پیچھے بھی لے جا سکتے ہیں پھر بھی مشکوک روابط، مبہم بیانات، افسانوی تعلق اور عدمِ تسلسل کی بنا پر مذکورہ

بیانات شاعرانہ ابہام سے ذرا بھی کم نہیں ہیں۔اس سلسلے میں قدیم مورخین کے یہ بیان بھی قابلِ غور ہیں کہ کشپ ریشی اپنے فرزند نیل جو ناگوں یعنی سانپوں کا راجہ ہے، کے پاس جا کر گھاس سے بنی چٹائی یعنی پتجّر پر بیٹھا یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ اگر آدم کی عمر دس ہزار برس کے آس پاس یا کم و بیش ہے تو 85 ہزار برس قبل جل بود یوکس انسان کو کھاتا یا مارتا تھا اور کشپ گھاس کی چٹائی پر جلوہ افراوز ہوا تو پورے جھیل میں شالی کی بوائی کہاں پر ہوتی تھی اور اگر 85 ہزار برس قبل پہاڑ کو ہل سے توڑا گیا تو یہ نسل انسانی کا کون سا دور ہے جس کی تاریخ موجودہ نسل کی تاریخ کے ساتھ مخلوط ہے؟!!

☆☆☆

☆۔۔۔خالد بشیر احمد
مترجم۔ارشد حسین

عبدالغنی شیخ......ایک جاں باز محقق

عبدالغنی شیخ ایک ایسا نام ہے جس کی گونج وادئ لداخ کی سنگلاخ وادیوں اوراس کے باہر بھی سنائی دیتی ہے جیسے ہمالیائی ہواؤں نے اپنی شانوں پراسے اُٹھا کر کوہساروں اور ریگزاروں میں اس کے نام کی عام منادی کردی ہو۔مرحوم اٹھاسی سال کی عمر میں 20اگست 2024ء کو داعی اجل کو لبیک کہہ کر ہم سے رخصت ہو گئے ۔ایک شہرت یافتہ مورخ،ممتاز افسانہ نگار،معتبر صحافی،لداخ کا درخشاں ستارہ جو اپنی آب وتاب کے ساتھ اُفق پر چمکتا رہا،تلاش وجستجو کا حریص،طلب وتجسس کا رسیا جیسے صفات سے مزین یہ مردِ درویش اپنی بساط لپیٹ کرہمیں داغ مفارقت دے کر چل بسا۔ان کی رحلت سے علم وادب،تاریخ وتہذیب، تحقیق وجستجو میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کو پورا کرنے کے لئے ایک طویل زمانہ درکار ہوگا۔لداخ خطے کے سب سے اعلیٰ سویلین اعزاز ''فخرِ لداخ'' حاصل کرنے کے محض پندرہ دنوں کے اندر وہ اپنے سفر آخرت پر روانہ ہوگئے ۔یہ اعزاز انہیں تبّتی روحانی رہنما دلائی لاما کے ساتھ مشترکہ طور ملا ہے۔قلم کے یہ دھنی یادداشت اور قوی حافظہ رکھتے تھے۔ان کے قلم سے قدیم و نایاب تہذیبی و ثقافتی روایات کی داستان جوئے آب کی مانند رواں ہوتی تھی۔ انہوں نے لداخ کی گم گشتہ تہذیب وتمدن اور روایات کی تاریخ کو باریک بینی سے تنگ وتاریک گلیاروں سے تلاش کر کے صفحہ قرطاس پر لا کر جاودانی بخشی اور عوامی و

اجتماعی یاداشت کا حصہ بنادیا۔

عبدالغنی شیخ 5 مارچ 1936ء کولداخ صوبہ کے لیہہ قصبہ میں پیدا ہوئے ہیں۔علم وادب کے ساتھ والہانہ لگاؤ اور تڑپ اُن کی سرشت میں پائی جاتی تھی جس نے انہیں لداخ کی نامور ادبی شخصیت اور تہذیبی و ثقافتی سفارت کار کے نام سے معروف کردیا۔ان کے علم وفضل کے چرچے جغرافیائی حد بندیوں کو پھلانگ کر دور دراز ممالک کے اندر ہونے لگے۔انہوں نے دنیا کے کئی اہم شہروں اور ممالک جیسے روم، برسٹول، برلن، ڈنمارک، برازیل، تہران، دہلی، اسلام آباد کا سفر کرکے وہاں ادبی سیمیناروں میں شرکت کرکے اپنے علم وفضل اور محققانہ صلاحیتوں کی دھاک بٹھا دی۔جہاں لب کشائی وخامہ فرسائی کا موقعہ ملا، لوگوں کے دل موہ لئے۔اپنے سامعین وقارئین کواس قدر اپنا گرویدہ بنادیا جیسے انہیں اپنی آواز اور امنگ ان کے اندر ملی ہو۔جیسے وہ انہیں کے احساسات کے ترجمانی کرتے ہوں۔وہ قلم اور الفاظ کے فقط شہسوار نہیں تھے، اُن کے اُفق کی حد قلم کی سیاہی اور الفاظ کی روانی تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ وہ تحقیق اور تلاش وجستجو کے سرخیل تھے جن کے دم پر انہوں نے لداخ کی تاریخی، تہذیبی وثقافتی ورثہ کی روایات اور بنیادوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا۔لائبریریوں اور کتب خانوں کی خلوتوں میں سکونت اختیار کرکے چھوٹی بڑی کُتب ودستاویزات کو کھنگال کر اور لوگوں کے سینوں اور یاداشت میں محفوظ زبانی روایات کو چُن چُن کر جمع کرکے سربستہ رازوں کو بے نقاب کرکے دنیا کے سامنے تحریری فصاحت کے ساتھ پیش کیا۔وہ ایک ایسے مورخ تھے جن کے سینے میں جان باز دل دھڑکتا تھا۔ایسے ادبی ماہر آثار قدیمہ جنہوں نے چھان پھٹک کرکے لداخ کے قدیم تاریخی میراث کو منصہء شہود پر لایا۔آپ کی تحقیق وطلب کا خصوصی میدان لداخ کی تاریخ اور لداخ کا وسط ایشائی ممالک ودیگر ہمسایہ خطوں کے ساتھ تعلقات رہا ہے۔اس خطے کو یہ امتیاز حاصل

رہا ہے کہ وہاں چند ممتاز و عالمی شہرت یافتہ مورخ پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے بڑی مہارت سے اپنے علاقے کی تاریخ وروایات کو تلاش کر کے محفوظ کر دیا ہے اور عبدالغنی شیخ ان ہی شخصیات میں سے ایک ہے جنہوں نے تاریخ کے مضمون میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور تاریخ نویسی اور روایات، خطے کی تہذیب وثقافت کو ضبط تحریر میں لاکرا پنے متقدمین سے سبقت لے لی۔ وہ تجسس وتحقیق،طلب وجستجو میں گُم ایک علمی قلندر تھے جنہوں نے تلاش اور دریافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔

عبدالغنی شیخ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اردو افسانہ نگاری سے کیا ہے۔کم سنی ہی میں انہیں افسانہ نگاری کی طرف دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔اُن کا پہلا افسانہ 1958ء میں سرینگر کے ایک اخبار میں شائع ہوا اور اس کے فوراًبعد ہی دیگر افسانے اور تحریرات ہندوستان کے معروف رسالوں اور جرائد میں شائع ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا جس سے دور افتادہ خطہ ارض سے ایک زوردار قصہ گو کے منصۂ شہود پر آنے کا اعلان ہو گیا۔ کئی دہائیوں سے بنا کسی ضعف اور تھکان وہ لداخ میں اردو زبان کی شمع کو تابنا کی کے ساتھ روشن کرنے میں منہمک رہے۔ان کی کئی ادبی تحریروں اور تصانیف کو مختلف بین الاقوامی اور علاقائی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا جن میں انگریزی، جرمن، ہندی، گجراتی، بنگالی، تیلگو اور کشمیری شامل ہیں۔وادی کشمیر اُن کے آبا واجداد کا وطن رہا ہے۔اُن کے دادا غلام محمد شیخ شہر سرینگر سے انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں لیہہ لداخ ہجرت کر کے چلئے گئے ہیں۔اپنے آبا واجداد کی نقل مکانی کی وجوہات کو جاننے کی تڑپ نے ان کے اندر تحقیق وتلاش اور قلم اُٹھانے کا ولولہ اور شوق پیدا کیا۔اس جذبہ کو دل ودماغ میں پالتے ہوئے سرینگر ہی میں وہ پہلی بار اخباروں، کتب خانوں اور ادبی محفلوں سے متعارف ہو گئے۔

میرے عبدالغنی شیخ کے ساتھ دوستانہ مراسم چار دہائیوں پر محیط رہے۔ہم

پہلی بار 1986ء میں لیہہ لداخ میں ملے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ ریڈیو کشمیر لیہہ کے نمائندہ ہوا کرتے تھے اور میں انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز آفس کا سربراہ تھا۔ سرکاری فرائض کی ادائیگی اور پیشہ ورانہ ذمہ داریوں نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا اور یہ تعلق اُن کے انتقال تک جاری رہا۔ اُن کے انتقال سے صرف ایک ہفتہ پہلے میں نے اُن کے ساتھ فون پر بات کی اور اُنہوں نے مجھے یہ اطلاع دی کی وہ اس وقت سرینگر میں Gall blader کا آپریشن کرانے کے سلسلے میں موجود ہیں۔ یہ بظاہر ایک سادہ اور عام سا آپریشن تھا جو ان کی موت کا موجب ثابت ہوگیا۔ آپریشن کی عمل آوری کے بعد وہ خطرناک انفکیشن کی زد میں آگئے جس سے وہ جان برآنہیں ہو سکے اور موت کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ پچھلے سال جولائی اور اگست مہینوں کے دوران میں مسلسل ان کے ساتھ رابطے میں رہا تا کہ اُن سے ہردم مفید مطلب معلومات وتفاصیل حاصل کروں جو مجھے اپنے Tryst with Ladakh نامی طویل تحریر کے لئے درکار تھیں۔ اُنہوں نے مجھے اس تحریر کی مناسبت سے حوصلہ افزائی کرنے کے لئے فون کیا اور اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ آیا میرے یہ الفاظ آپ کی مستقبل قریب میں آنے والی کتاب میں جگہ پائیں گے۔ 1987ء میں میرا لیہہ سے تبادلہ ہونے کے بعد میں کئی مرتبہ وہاں گیا اور ہر دفعہ میں ان سے ملنے کے لئے اُن کے گھر یا کسی اور طے شدہ جگہ پر ضرور چلا جاتا تھا۔ ایسی علمی شخصیت اور طبعی عجز وانکسار کے حامل انسان کے ساتھ ملاقات وگفت وشنید ہمیشہ باعث فرحت اور تسلی بخش ہوتا تھا۔ وہ لداخ کے متعلق معلومات کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے اور علم وفضل کا گنجینہ، آرائش ونمائش سے کوسوں دور اپنی ہی دُھن میں محو استغراق رہتے تھے۔ خاموشی اُن کی طبیعت ثانیہ تھی۔ سکوت اور ٹھہراؤ کا وصف اُن کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ لایعنی اور فضول کلام کی بجائے ضرورت پڑنے پر ہی لب

کشائی کرتے تھے۔

ان کے ساتھ ہم کلام ہونے سے ہمیشہ علم و دانش اور گنج ہائے بے بہا معلومات کے موتی ہاتھ لگتے تھے۔ان کے کلام کی شیرینی کسی لذیز پکوان کی لطافت سے کم نہیں ہوتی تھی۔منکسر المزاجی،سادگی،دیانت وراست گوئی اور سنجیدگی ومتانت جیسے اوصاف سے متصف یہ بندۂ خدا کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی کبھی اونچی آواز میں بات کرتے تھے۔اُن کے لہجے اور آواز سے بھی وقار اور متانت جھلکتی تھی۔ان کے ہاں ہر چھوٹے بڑے کے لئے عزت تھی اور بلا لحاظ عمر ومرتبہ ہر ایک کے ساتھ احترام وخندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔وہ ریا کاری،نمود ونمائش اور تشہیر بازی سے کوسوں دور تھے۔اپنے پوتے کی شادی کے موقع پر وہ باراتیوں کے ساتھ عام سا ٹریک سوٹ پہن کر شامل ہوگئے۔اپنے ہڑ بڑائے ہوئے ڈاکٹر بیٹے کو اس بات پر راضی کیا کہ اسے آراستہ اور غیر رسمی لباس کے بجائے رسمی اور معمول کا لباس پہننے سے آسائش اور آرام ملتا ہے۔وہ اس حال میں دنیا سے کوچ کر گئے کہ ان کے بینک کھاتہ میں کوئی بھی پیسہ جمع نہیں تھا جو اس بات کا آئینہ دار ہے کہ ان کی زندگی میں حرص وطمع اور لالچ نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔اُنہیں اپنے تہی دست ومفلوک الحال ماضی کے بارے میں کوئی باک نہیں تھا اور برملا اور فخریہ طور اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ میرے والد بزرگوار لیہہ کے بازاروں میں ریڑی لگا کر خوبانی اور سیب ومیوہ جات بیچا کرتے تھے۔لوگوں کے ساتھ کلام وگفتگو اور امور ومعاملات میں انہوں نے کبھی شائستگی اور تہذیب کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔میری ان کے ساتھ عمر کے لحاظ سے دو دہائیوں کا فرق تھا پھر بھی وہ میرے ساتھ ایک ہم سن دوست کی طرح پیش آتے تھے۔1980ء کی دہائی کے آخری برسوں کے دوران سرینگر میں اپنی تعیناتی کے دنوں وہ میرے دفتر ملاقات کی غرض سے یا محکمہ اطلاعات حکومت

جموں وکشمیر کی طرف سے شائع ہونے والے اردو ماہنامہ ''تعمیر'' کے لئے لداخ کی تاریخ اور تمدن پر اپنا کوئی تحقیقی مقالہ دینے کے لئے آتے تھے جس کے لئے وہ بلا ناغہ لکھتے تھے۔

عبدالغنی شیخ کی ریڈیو کشمیر سرینگر میں بحیثیت نیوز ایڈیٹر تعیناتی کا وہ دور تھا جب وادی کشمیر میں افراتفری کا ماحول چہار سو پھیلا ہوا تھا اور نیوز نمائندوں اور ایڈیٹروں کے لئے یہ ماحول بہت ہی کٹھن اور دشوار ترین تھا۔ وادی میں عسکریت زور پکڑی ہوئی تھی۔ سیول انتظامیہ غیر موثر ہو چکی تھی اور گورنر انتظامیہ کو وجود میں لایا گیا تھا۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو معیاری طریقے سے انجام دہی میں یقین رکھتے تھے چونکہ انہیں محکمہ کی طرف سے منعقد کئے گئے تربیتی پروگراموں میں اسی چیز کی جان کاری اور مہارت حاصل ہوئی تھی۔ ایک پیشہ ور نیوز ایڈیٹر خبروں کی اشاعت وتشہیر میں حقائق اور غیر جانب داری کا دامن کسی بھی حال میں نہیں چھوڑتا ہے۔ ریڈیو کشمیر سرینگر میں تعیناتی کے دوران خبروں کے انتخاب میں سیاسی دخل اندازی سے اسے بہت کوفت اور قلبی انقباض پیدا ہوا تھا جو کہ وزارت کی طرف سے وقفے وقفے سے جاری شدہ رہنما اصولوں کے بالکل برعکس اور متضاد تھا۔ 1991ء میں جب شیخ کا تبادلہ دہلی کر دیا گیا تو اُنہوں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست دے کر اپنے اصلی ریٹائرمنٹ کی تاریخ سے تین سال پہلے ہی سرکاری ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی۔ اس کے فوراً بعد وہ سیدھے اپنے آبائی قصبہ لیہہ لداخ لوٹ آئے جہاں وہ ادبی و علمی اشغال اور سماجی سرگرمیوں کے ساتھ منہمک ہو گئے۔

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ بڑے تپاک اور ذوق شوق کے ساتھ علم وادب، تحقیق وتلاش اور طلب وجستجو میں محو ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اُنہوں نے علمی وادبی سیمیناروں میں شرکت کے لئے دنیا کے کئی ممالک کا سفر کیا۔ اُن کی کئی کتابیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں جن میں اُن کے افسانوں کا مجموعہ،

ناول اور بالخصوص لداخ کی تاریخ وتہذیب پراُن کا تحقیقی کام شامل ہے۔اُن کی اصلی اور معروف تصانیف میں Reflections of Ladakh, Tibet and Central Asia، لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے، (Important Corners of Ladakh's History)، دو ملک ایک کہانی ، (Two Countries, One Story)، لداخ محققین اور سیاحوں کی نظر میں، لداخ: تہذیب و ثقافت ، (Forsaking Paradise) اردو افسانوں کا انگریزی ترجمہ قابل ذکر ہیں،۔اُنہوں نے 'لداخ کی نئی تاریخ' نام کی ایک اور کتاب کا مسودہ بھی پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا لیکن یہ کتاب چھپ کر منصۂ شہود پر نہیں آسکی۔ Reflections of Ladakh, Tibet and Central Asia اور ایک اردو ناول ''دل ہی تو ہے'' کو جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ ، کلچر اینڈ لینگویجز کی طرف سے Best Book Award دیا گیا ہے۔اُنہوں نے کئی محققین بشمول غیر ملکی محققین کو تحقیقی مقالوں اور ڈاکٹریٹ کے مقالوں کو مرتب کرنے میں رہنمائی کی اور ایک استاد کا کردار نبھایا ہے جموں یونیورسٹی کی طرف سے عبدالغنی شیخ کی ادبی خدمات پر پی۔ایچ۔ڈی کا پروگرام کرانا، یونیورسٹی آف دہلی اور یونیورسٹی آف اندور کی طرف سے ایم۔فل کرانا، شیرازہ اردو کا عبدالغنی شیخ نمبر، فی نفسہ اُن کی بحیثیت مصنف، مورخ، سماجی کارکن اور ادبی وعلمی خدمات کا اعتراف ہے، جس کے وہ بلا شبہ مستحق تھے اور جو اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ عبدالغنی شیخ کی علمی و ادبی خدمات اعلیٰ پایہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس معیار اور مرتبہ کے ہیں جو ملک کے ممتاز تحقیقی اداروں میں کسی منضبط تحقیق کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ یہ اعزاز بلا شبہ عبدالغنی شیخ کی خدمات کا اعتراف اور اقبال ہے۔ ☆☆☆

☆۔۔۔ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی

سفر نامۂ ملیشیا

5 فروری 2016ء ملیشیا کے وقت کے مطابق رات کے گیارہ بجے ملیشیا کی فلائٹ تھی۔اس سے پہلے میں نے ملیشیا نہیں دیکھا تھا۔رات کے وقت جہاز کی پرواز تھی اور 6 فروری کی صبح جب گھڑی نو بجا رہی تھی اور ملیشیا کے ٹائم کے مطابق ساڑھے گیارہ بجے ملیشیا پہنچ گئے۔ ہندوستانی وقت ملیشیا سے ڈھائی گھنٹے پیچھے ہے۔امگریشن وغیرہ کرنے کے بعد ابھی باہر آ ہی رہے تھے تو سامنے ہمارا بیٹا انتظار کر رہا تھا۔وہ ابھی دسمبر میں ہی چھٹیاں منانے گھر آیا تھا۔دراصل کشمیر کی سردی، برف اور چلۂ کلان سے بچنے کے لئے آئے تھے۔کیونکہ ملیشیا میں سارا سال گرمی پڑتی ہے اور A C چلتا ہے اور سارا ہی سال وقت ایک جیسا رہتا ہے۔یعنی نہ دن چھوٹے بڑے ہوتے ہیں اور نہ راتیں۔مشکل سے آدھے گھنٹے کا فرق پڑتا ہے۔

ہم نے گاڑی میں سامان ڈال دیا جو بیٹا ساتھ لایا تھا۔۱۲۰ کی سپیڈ پر گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ پہلے تو میں ڈرنے لگی۔مگر جب دیکھا کہ سب گاڑیاں اسی سپیڈ سے چلتی ہیں اور سڑکیں ایسی ہیں جیسے ہوائی جہاز ان سڑکوں پر چل رہا تھا۔عادت کے مطابق ہم نے گاڑی کے شیشے کھول دیئے۔مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ اس سپیڈ کے ساتھ شیشے کھول کر نہیں چل سکتے۔جلدی سے شیشے بند کر کے اے۔سی چالو کیا تو راحت کی سانس لی۔کیونکہ گرمی نے اتنی ہی دیر میں اپنا جلوہ دکھا دیا تھا۔ہمیں پاگو جیا (Pago Jaya) جانا تھا جو Town یا Village کا نام تھا اور اس State کا نام جہاں ہمیں جانا تھا جوہر بارو (Johar Baro) تھا۔راستے کیا تھے جیسے

جنگلوں کے بیچوں بیچ بڑی بڑی شاہراہیں بنائی گئیں تھیں۔ اس شاہراہ کے دائیں بائیں Palm Trees لگے ہیں۔ یہ ملک Palm Oil میں کافی خودکفیل ہے اور دنیا بھر کو اس ملک سے Palm Oil برآمد کیا جاتا ہے۔ ان درختوں کی وجہ سے خوبصورتی میں چار چاند لگے ہیں۔ جس طرف آپ دیکھتے ہیں یا جہاں تک آپ کی نظر جاتی ہے صرف اور صرف Palm tree ہی نظر آتے ہیں۔

راستے میں چائے کی طلب ہوئی۔ ہم ایک ریسوران میں گئے اور وہاں چائے پی لی۔ مگر وہاں کی چائے کیا تھی، ایک دم یا تو دودھ کے بغیر یا پھر اس میں میٹھا دودھ ڈالتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں قابل قبول نہیں تھیں۔ دن کے ایک ڈیڑھ بجے ہم ڈیرے پر پہنچ گئے۔ کھانا کھا کر سو گئے۔ ایک تو رات بھر کا سفر تھا اور نیند کی کمی اور تھکاوٹ۔

7 فروری کی صبح کو ہم نے کولالمپور جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ 8 اور 9 فروری کو ملیشیا میں Chinese New Year مناتے ہیں اور سارے ملیشیا میں اس کی تیاری ہو رہی تھی۔ ہم پہلے Twin Tower دیکھنے گئے۔ اس کو انگریزی زبان میں KLCC یعنی ''کولالمپور کنونشنل سنٹر'' کہتے ہیں۔

Twin Tower دو اونچی اونچی عمارتیں ہیں جو ایک جیسی ہونے کے لئے Twin کہلاتی ہیں۔ یہ دنیا کی اونچی عمارتوں میں مانی جاتی ہیں۔ یہ ۶۵ منزلہ عمارتیں ہیں۔ یہ دونوں ٹاور ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہیں۔ ان کو اندر سے ملانے کے لئے ایک جگہ بنائی گئی ہے جس کو Skywalk کہتے ہیں۔ یہ ٹاور ملیشیا کی سب سے بڑی سیاحتی کشش (Attraction) ہے۔ اس میں بے شمار آفس اور بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ یہ اس قدر وسیع اور خوبصورت ہیں کہ ان کو دیکھ کر جی ہی نہیں بھرتا۔ اس میں ایک منزل ریسٹورنٹ اور کھانے پینے کی اشیا کے لئے ہے۔ یہ جتنا پُرکشش

دن میں نظر آتے ہیں اس سے کئی گُنا رات کو خوبصورت نظر آتے ہیں۔

Twin Tower سے نکل کر ہمیں ایک Islan (جزیرہ) پہ جانا تھا جس میں ہوٹل کی بکنگ کر رکھی تھی۔ اس کا نام Penang پینَنگ آئی لینڈ تھا۔ شام کو وہاں پہنچنے کے بعد ہم اسی وقت West Beach پر چلے گئے۔ مگر اندھیرا ہونے کی وجہ سے کچھ خاص نظر نہیں آر ہا تھا۔ مگر وہاں کی بُو سے لگ رہا تھا کہ مچھواروں کا Beach ہے۔ کچھ کشتیاں اور Boats بھی تھے مگر کوئی بھی چل نہیں رہی تھیں۔ سمندر کے بیچوں بیچ پیدل چلنے کا ایک پُل بھی بنایا گیا تھا۔ اُس پُل پر ہم پیدل چلے۔ مگر وہاں بھی مچھواروں اور چند تازہ عاشقوں کے سوا کچھ نہ ملا کیونکہ یہ جگہ بہت سنسان تھی۔

واپس ہوٹل کا رُخ کیا۔ اس کا نام او کے ہوٹل تھا۔ سامان چھوڑ دیا اور تھوڑی دیر ستانے لگے۔ پھر کھانا کھانے کی طرف نکل پڑے۔ ایک ریسٹورنٹ میں پہنچے جس کا نام Nasikandre Astana تھا۔ ناسی کاندار ملیشیا کا مسلمان ہوتا ہے۔ جس ہوٹل پر یہ نام لکھا ہوتا ہے وہ ملیشیوں کا اپنا ہوٹل ہوتا ہے۔ اندر جا کر معلوم ہوا کہ اس میں ایک ہندوستانی جو مدراس کا تھا کام کرتا تھا۔ اس سے زبان کی سہولیت ہوگئی کیونکہ وہاں کے لوگ (ملے) بولتے ہیں جو ہمیں نہیں آتی تھی۔ کیا کیا پکا تھا اس سے ہمیں معلوم ہوا۔ چکن اور مچھلی بہت قسموں میں بنی تھی جو میری آنکھوں کو بھلی معلوم ہوئی وہ آڈر کیا۔ مگر معلوم ہوا کہ اس میں مرچوں کے ساتھ ساتھ میٹھا بھی بہت ڈالا گیا تھا۔ ملیشیا کے لوگ نمکین نہیں کھاتے ہیں بلکہ نمکین میں بھی میٹھا ہوتا ہے۔ جس کو ہم کشمیری میں ''یکہ مُدھر'' کہتے ہیں۔ یعنی ایک ساتھ میٹھا اور نمک ڈال کے۔

دوسرے دن یعنی 9 فروری کی صبح Island Binyne میں باتو فرنگی بیچ (Bato Firangi Beach) پہنچ گئے۔ اس سمندر کے کنارے لوگوں کا بڑا ہجوم تھا۔ وہاں پر Jeet Ski یعنی موٹر بوٹ تھی اور Para Sailing تھی جو

اڑتے ہی چھتری کی طرح کھلتی ہے اور انسان بادلوں کی طرف چلا جاتا ہے۔اس میں ایک یا دو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔خوب مزے کئے۔بچوں نے تو سکینگ کا خوب مزہ لیا اور ہم نے بچوں کو دیکھتے ہوئے مزے لئے۔کھانے کے لئے وہاں برگر اور سموسہ جیسے کچھ تھا جس کا نام دکان میں کچھ ایسا لکھا تھا۔

"Tabing Spice Cheese Shake .Coconut Kerapo ,Martaba'

وہاں سے نکل کر ہم ایک اور سمندر کنارے پہنچے۔وہ کنارا لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے پاک تھا۔وہاں بہت سارے خاندان آئے تھے اور پانی میں تیر رہے تھے اور کھیل رہے تھے۔وہاں پانی کا کوئی کھیل نہ تھا بلکہ یہ وہاں کے Locals کے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔وہاں لوگ پانی میں اتر کر پانی کا مزہ لیتے ہیں۔یہاں کی ریت کافی پتلی ہے اور ریت کا رنگ ہلکا بھورا ہے۔ملیشیا میں ہر جگہ ریت ایسی ہی ہے۔چائے پینے گئے تو چار قسم کی چائے ملتی ہے، جس چائے کو وہ Tao Limo Ice کہتے ہیں، ہم اسے لیمن ٹی کہتے ہیں۔Milo Ice یہ میلو چاکلیٹ جو ہم یہاں بچوں کو کھلاتے ہیں وہ وہاں یخ یا برف کے ساتھ کولڈ ڈرنگ کی طرح پیا جاتا ہے۔Teh Tarik یہ لپٹن جیسی چائے ہے مگر مزہ لپٹن کا نہیں آتا ہے۔ Copi Tarik وہاں کی کافی (Coffee) ہے۔

ہم شام کے وقت وہاں سے نکلے تو راستے میں ایک مارکیٹ تھا ہم وہاں اترے۔وہ نائٹ مارکیٹ تھا۔جس کو وہ Pasar Malam کہتے ہیں۔اس مارکیٹ میں چھوٹی چھوٹی بہت ساری چیزیں بکتی ہیں اور کھانے پینے کی سینکڑوں اشیا بھی۔ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے چار یا پانچ گھنٹے لگتے ہیں۔

دس فروری کو منگل کے دن او۔کے ہوٹل سے نہا دھو کے صبح کے گیارہ بجے نکلے۔آستانہ کے پاس بریک فاسٹ کرنے بیٹھ گئے۔ہوٹل کے ہندوستانی کارکن

سے پوچھا کہ کیا کیا چیزیں دستیاب ہیں۔کھانے میں ہم سادہ چاول اور تندوری چکن اور ٹماٹر کی چٹنی کھاتے تھے اور ناشتے میں اس نے ہندوستانی پراٹھے اور دو دو انڈوں کے آملیٹ بنا کے دیئے وہ ہمارا بریک فاسٹ کم لنچ بن گیا۔ہم نے پھر ایک بار کوالالمپور کا رخ کیا۔ہمارا ارادہ تھا کہ ہم International Islamic University of Malysia جائیں گے۔چار پانچ گھنٹوں کا سفر اور وہ بھی اپنی گاڑی میں۔خدا خدا کر کے پہنچ گئے اور وہاں کی لائبریری، انجینئر نگ ونگ، آئی۔ٹی ونگ، لاء ڈپارٹمنٹ دیکھ لئے۔اس کے بعد وہاں کی سب سے بڑی چیز یونیورسٹی کی مسجد دیکھنے گئے۔وہ مسجد کیا ہے، آرکیٹیکچر کا ایک نمونہ ہے۔وہاں پہنچ کر مغرب کی نماز ادا کی۔

وہاں سے ایک Mall میں داخل ہوئے۔اس کا نام Berjaya Time Square ہے۔یہ Mall سولہ منزلہ ہے۔اس میں ہوٹل، دکانیں اور آفس ہیں۔اس کے ٹاور میں Adventure Theme Park ہے۔یہ جگہ بچوں کو attract کرنے کے لئے زبردست جگہ ہے۔یہ پارک Level 5 سے Level 10 تک ہے۔اس میں Roler Coaster,Philip Devit جس کا نام Odyssey ہے۔یہ ایک قسم کے جھولے اور ٹرینیں تھیں جو ایک پہاڑی پر سے چڑھتی اور دوسرے سے اترتی تھیں۔بچوں کے چلانے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ہر طرف سے بچے ڈر کے مارے چلا رہے تھے۔مگر کھیل چھوڑ بھی نہیں رہے تھے۔

دوسرا جھولا Dizzt Izzy تھا۔بچے ایک جھولے سے اترتے تھے اور دوسرے پر چڑھتے تھے۔ان جھولوں کی ٹکٹ کم بھی نہیں تھی۔ایک ایک جھولے کی ٹکٹ ۵۰ رنگیٹ تھی اور ایک رنگیٹ ہندوستانی ۱۸ روپئے کے برابر تھا۔اس کے بعد Mcdonals گئے، وہاں سے آئس کریم کھائی اور اسی مال میں شاپنگ کر کے

واپسی کا راستہ لیا۔ ہر Mall میں میکڈونلز اور کے۔ایف۔سی ہوتے ہیں ۔ ہر ملک کے ہر شہر میں انہوں نے اپنا بزنس بنایا ہے۔10 تاریخ کی شام ہوتے ہوتے اور پاگو جیا پہنچتے پہنچتے رات کے ساڑھے بارہ بج گئے۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔راستے میں ایک جگہ تھوڑا بہت کھایا اور پیٹ کی آگ بجھائی مگر یہ آگ ایسی ہے کہ ایک بار میں بجھتی نہیں ، بار بار لگ جاتی ہے اور بار بار بجھانی پڑتی ہے۔ پھر ۱۲۰ کی سپیڑ میں دوڑ پڑے۔گھر پہنچ کر جلدی سے چاول بنائے۔میٹ کی preperation میں وازے کے کچھ ٹن جو سرینگر سے ہم نے ساتھ لائے تھے، انہی میں سے ایک ٹن نکالا اور کھایا یہاں تک کہ ڈیڑھ بج گیا۔کب سو گئے اور کب صبح کے نو بج گئے کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔صبح بچوں کو دفتر جانا تھا، انہوں نے کارن فلیکس کھایا اور آفس کے لئے دوڑ پڑے۔

بڑے بیٹے کو سنگاپور جانا تھا اور چھوٹے کو جوہر بارو کے دفتر۔ہم سرینگر سے آنے والے دن کو پڑے رہے۔سرینگر سے آنے والوں میں میری بیٹی بھی تھی جو چند دنوں کے لئے آئی تھی۔ بڑا بیٹا ویکنڈ (Weekend) ہمارے ساتھ گزارنے آیا تھا۔ اب اس کو پھر سے پانچ دن دفتر جانا تھا۔

شام کو چھوٹے بیٹے کے آنے کے ساتھ ہی لوکل مارکیٹ کی طرف نکل پڑے۔وہ مارکیٹ ہر بدھوار کو لگتا ہے جس میں قسم قسم کی چھوٹی بڑی چیزیں ہوتی ہیں اور اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔میں نے اکثر دیکھا کہ ہر دکان اور ہر سٹال پر عورتیں ہی کھانا بناتی ہیں اور وہی بیچتی ہیں۔لڑکیاں ہر چھوٹی بڑی دکان چلاتی ہیں۔وہاں قسم قسم کے کھانے ہوتے ہیں اور ان کھانوں میں:۔

(ا) ساتے ایام Satat Ayam:۔۔یہ چکن کے سیخ تُج ہوتے ہیں مگر اس میں نمک مرچ کے ساتھ میٹھا ڈالا ہوتا ہے جو ہمارے گلے سے نہیں اترتا ہے۔

(۲) ساتے داغنگ Satay Dagging:۔۔یہ Beef Sticks ہوتی ہیں اور یہ بھی میٹھی اور نمکین ہوتی ہیں۔

(۳) چارکارتیو Char Cartio:۔۔نوڈل کو ساس ڈال کے مرچ وغیرہ ڈالتے ہیں۔

(۴) ناسی لمک۔Nasi Limak:۔۔چاول کے اوپر Chilli کوٹ کے، اس کے اوپر سوکھی مچھلی اور آدھا انڈا اور Pea Nuts ہوتے ہیں۔یہی ملیشیا کا اصل کھانا ہے۔اس کو مَلے کھانا کہتے ہیں۔مچھلی کا استعمال وہاں بہت زیادہ ہوتا ہے کیونکہ سمندر اور بندرگاہیں بہت زیادہ ہیں۔اس لئے مچھلیاں اور سوکھی مچھلیاں بہت ہیں۔مچھلیوں کی قسمیں بھی ہیں اور سمندر کے ہر قسم کا فوڈ دستیاب ہے۔

چینٹ مال: 12 فروری کا دن گھر پر ہی گزرا مگر شام ہوتے ہوتے فرزند کے آنے کے بعد Gaint Mall چلنے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔پا گوجیا سے تقریباً ۲۷ کلومیٹر کی دوری پر یہ جینٹ مال سچ مچ کا جینٹ تھا۔یہ دومنزلہ ہے مگر تقریباً فٹ بال فیلڈ سے بڑا ہے۔اس کو اگر ایک کونے سے دیکھیں گے تو دوسرا کونا نظر نہیں آئے گا۔اس مال کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں آپ سوچیں گے وہ وہاں دستیاب ملے گی۔سبزی، دالیں، جوس، صابن، برتن، گیس چولہے، شیمپو، جوتے اور سونے کے زیورات غرض آپ کے ذہن میں جو چیز بھی آئے وہ وہاں پر موجود ہے۔ان کی قیمتیں اصل مارکیٹ سے سستی ہیں۔(ایسا ہی ایک مال جموں میں بھی کھولا گیا جس کو WAVE MART کہا جاتا ہے۔وہاں بھی چیزیں سستی ہیں مگر اتنی چیزیں وہاں بھی نہیں ہیں۔)

اسی دن واپسی پر ہم BANDHAR MAHARANI گئے۔وہ دراصل ایک بندرگاہ ہے جہاں سے FERRIES نکلتی ہیں جو مسافروں کو ایک

جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ فیری اصل میں ایک چھوٹا سا سمندری جہاز ہے جس میں تیس چالیس مسافر بیٹھ سکتے ہیں۔اس میں کھانے پینے کا انتظام ہوتا ہے۔ آپ جوخریدنا چاہتے ہوں وہ خرید سکتے ہیں۔اس میں واش روم بھی ہےاور چھت پر جانے کی جگہ بھی۔ وہاں سے سمندر کا خوبصورت نظارہ بھی دیکھ سکتے ہیں اور پانی کا وہ بہاؤ بھی جو فیری کے چلنے سے پانی میں اٹھتا ہے۔اس بندرگاہ پرایک پارک بنائی گئی ہے جہاں لوگوں کا تانا بندھا رہتا ہے اور چیزیں بیچنے والوں اور خریدنے والوں کی بھیڑ بھی رہتی ہے، خاص کر بچوں کی بھیڑ۔ سمندر کے کنارے راجہ رانی کا محل نظر آتا ہے۔اسی لئے اس کو''باندھار مہارانی'' کہتے ہیں۔ وہ محل طرح طرح کے قمقموں سے سجایا گیا ہےاوراس میں رنگ برنگی روشنی جلتی رہتی ہے۔

اگلے دن جمعہ تھا۔اس دن عورتیں گھر پر ہی بیٹھی رہیں اور مرد حضرات نماز کے لئے گئے۔ مسجد ہمارے گھر سے آدھے کلومیٹر دوری پر تھی۔ اس وجہ سے وقت پر گئے اور نماز ادا کر کے واپس آ گئے۔

ملیشیا میں بہت سارے مقامات دیکھنے کے قابل ہیں۔ان کے یہاں اکثر مالز ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں جب گھر سے باہر جانا ہوتا ہےتو ہم کسی باغ یا کسی مغل گارڈن میں جاتے ہیں۔مگر باہر کے ملکوں میں اگر گھر سے باہر جانا ہوتا ہےتو مال میں جاتے ہیں اور وہاں گھنٹوں گزارتے ہیں۔

پسار بیسر:۔ ملیشیا میں بڑے مارکیٹ کو اصل میں پسار بیسر کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک مال ہی ہے جو ایک بستی کے بالکل قریب ہے۔اس میں دالیں، میوے، گوشت، مچھلیاں، مرغے، بریڈ، چاول، آٹا، صابن کون سی چیز ایسی ہے جو نہیں ملتی۔کھانے پینے کی چیزیں، پہننے کی چیزیں اور کپڑے برتن وغیرہ دھونے کی چیزیں غرض ہر طرح کی چیزیں ملتی ہیں۔

کولالمپور سنٹرل:۔۔یہ اصل میں ایک ریلوے اڈہ ہے جو ملیشیا کے اندرون سے لے کر ملیشیا کے بیرون تک جاتا ہے۔ یہاں ہر جگہ کے لئے ٹرین نکلتی ہے مگر ریلوے تک جانے سے پہلے ایک بڑا سا مال ہے۔

K.L.SOGO۔ یہ بھی سات منزلہ مال ہے اور چار لیول انڈر گراونڈ کار پارکنگ ہے۔ایک منزل Ready Made کپڑوں کے لئے مخصوص ہے۔ان میں ہندوستانی کرتے وغیرہ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کپڑے کی دکانوں میں ہندوستانی کپڑا بھی مل جاتا ہے جو بہت ہی مہنگا ہے۔ایک منزل پر جوتے اور بیگ اور پرس ہیں اور ایک منزل کھانے پینے کی چیزیں۔ ہر چیز کی فراہمی ایک چھت کے نیچے ہے۔کوئی بندہ کہاں تک دیکھ سکتا ہے۔حالانکہ ایسکلیٹر لگے ہوئے ہیں مگر اس کے باوجود چلتے رہو اور دیکھتے رہو۔ان جگہوں پر صرف بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ جب انسان تھک ہار کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اس کو کھانے پینے کی میز پر بیٹھ کر کچھ آڈر کرنا ہے اور کھانا ہے۔تب ہی وہ اپنے تھکے پیروں کو کچھ آرام دے سکتا ہے۔

کولالمپور مارکیٹ:۔۔کولالمپور کا مارکیٹ بہت ہی خوبصورت ہے۔دکانیں سجی ہوئی ہیں۔کہیں جگہ کھلی ہے تو لوگ آ کر تماشا دکھانے آتے ہیں۔تماشا کیا ہوتا ہے کوئی گانا گاتا ہے،کوئی ڈانس کرتا ہے اور لوگ تماشائیوں کی طرح ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔گھنٹوں گزر جاتے ہیں ،ان کو کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں۔تماشا دکھانے والے یا موسیقی بجانے والے اپنا پروگرام ختم کرنے کے بعد اپنی ٹوپی یا اپنی تھیلی لے کر لوگوں کے پاس جاتے ہیں جو ان کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں اور وہ اس میں پیسہ ڈالتے ہیں۔اکثر لوگ ان کو پیسے دیتے ہیں۔

Pago Jaya پروجیکٹ تقریباً ایک سو ہیکٹر زمین پر بنایا جا رہا ہے۔اس میں پالی ٹیکنک کالج،انجینئرنگ کالج اور اسلامک یونیورسٹیاں شامل

ہیں۔اس کے علاوہ اس میں سٹوڈنٹس سٹی بنائی جارہی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سٹوڈنٹس کے لئے ان کی آسانی کے لئے ساری سہولیت میسر ہوتی ہے۔ان کے لئے ہوسٹل،ان کے والدین اگر ملنے آئیں تو ان کے لئے الگ ہوسٹل،خریداری کے لئے الگ مال۔کھیل کود کے لئے گراونڈ،سٹیج وغیرہ غرض سٹوڈنس سے وابستہ ہر چیز اس شہر میں موجود ہے۔جیسے ایک نیا شہر بنایا جا رہا ہے جس میں ہزاروں لوگ کام کر رہے ہیں۔سینکڑوں انجینئر،کارپینٹر،پلمبر اور دیگر ماہر کار کام کر رہے ہیں۔ہر جگہ،ہر بلڈنگ پہلے سے پلان کے مطابق بنائی جاتی ہے۔وہاں سوچ سمجھ کر شہر بنایا جاتا ہے۔ان کے پاس اتنی زمین ہے اس میں شہروں کے شہر بسائے جاسکتے ہیں۔

ملیشیا کی ایک یہی چیز مجھے سب سے اچھی لگی کہ یہاں کی کالونیاں سب ایک جیسی ہیں۔ہر مکان ایک ہی شکل کا ہے۔ایک رنگ،ایک رنگ کی چھت (ان کی چھتیں بھی ہماری طرح ٹین کی ہوتی ہیں۔کیونکہ وہاں بہت زیادہ بارشیں ہوتی ہیں) ایک جیسے گیٹ،ایک جیسے مکانوں کی شکل ہوتی ہے۔اگر ایک منزلہ ہے تو سب ایک منزلہ۔اگر دومنزلہ ہے تو صرف دو منزلہ،کوئی دیوار نہیں۔کوئی سرحدیں نہیں۔گیٹ بھی ایسے کہ اندر باہر سب نظر آتا ہے۔وہ گرل(Grill) کے بنے ہیں دیواریں بھی گرل کی ہیں۔مگر کوئی کسی کو دیکھتا اور جھانکتا نہیں ہے۔کسی کو نہیں معلوم کہ کون کہاں رہتا ہے۔اگر کسی کی نظر کسی پر پڑ بھی گئی تو جھٹ سے سلام کرتے ہیں۔اگر منہ سے سلام نہیں نکلا تو تھوڑا سا سر جھکا کر سلام کا اشارہ کرتے ہیں۔سب اپنی اپنی جگہ خوش ہیں۔عورتیں مرد سب کام کرتے ہیں۔عورتیں بالکل باپردہ ہوتی ہیں۔ان کی ایک خاص ڈریس ہے جس میں ایک لمبی قمیض ہے اور ایک لمبی اور تھوڑی ٹائٹ سکرٹ ہے اور سر پر سکارف یا حجاب ہے۔یہ ڈریس سنگاپور سے بالکل برعکس ہے،وہاں کی لڑکیاں اور عورتیں بھی پتلون اور شرٹ پہنتی ہیں۔یہاں بھی لڑکیاں اور عورتیں پینٹ

اور شرٹ پہنتی ہیں مگر زیادہ تر اپنا قومی ڈریس ہی پہنتی ہیں ۔مگر سکارف یا حجاب ضروری ہوتا ہے۔ وہ شرٹ اور پینٹ اتنا کھلا ہوتا ہے کہ بالکل بھی فیشن نہیں لگتا ہے۔

ملیشیا کی عورتیں بہت محنتی ہوتی ہیں (ویسے تو عورتیں ہر جگہ محنت کرتی ہیں) یہاں بازاروں میں جو کھانے پینے کی چیزیں ملتی ہیں وہ اکثر و بیشتر عورتیں ہی بناتی ہیں اور وہی بیچتی ہیں ۔ مرد حضرات بہت کم بازاروں میں اور دکانوں میں نظر آتے ہیں ۔ کپڑوں کی دکانیں ہوں یا کس اور چیز کی دکان، سبزی ہو یا میوہ ہر جگہ سیلز گرلز ہی نظر آتی ہیں جو باضابطہ وردی میں ہوتی ہیں ۔

یہاں کی سڑکیں اور قومی شاہراہیں بہت شاندار ہیں ۔کسی بھی طرف سے داخل ہو جائیں، آپ کا راستہ کارڑ Swipe کرنے پر ہی کھلے گا اور جب آپ اس شاہراہ سے باہر آرہے ہیں تو آپ کو ٹول بھرنا پڑے گا۔ آٹو میٹک مشین ہی آپ کو بتاتی ہے کہ کتنا بھرنا ہے۔ وہ آپ کارڈ سے بھر لیتے ہیں تبھی آپ کا راستہ کھل جائے گا اور آپ آگے جا سکتے ہیں ۔ ہر داخلہ کارڈ سے کھلتا ہے اور ہر Exit بھی کارڈ سے ہی کھلتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ بنا پیسے ادا کئے نکل جائیں ۔ وہاں کی پارکنگ بھی کچھ اسی قسم کی ہے ۔ پارکنگ میں جاتے ہوئے آپ کارڈ سے انٹری (Entry) کرتے ہیں اور واپسی پر بتایا جائے گا کہ کتنا پارکنگ فیس بھرنا ہے۔

کار پارکنگ میں آپ جب کارڈ سے داخل ہوتے ہیں تو اکثر جگہوں پر کار پارکنگ چھ ،سات یا آٹھ منزلوں پر ہوتی ہے اور وہ بھی زمین دوز۔ان کو ABCDEFG جیسے نشانات لگائے گئے ہیں ۔ جیسے A1,A2 B6 B7 وغیرہ نمبر لکھے ہیں اور کاروں کے لئے جگہیں بنائی گئی ہیں ۔ آپ پارکنگ ڈھونڈتے ہیں تو خالی جگہ پہ سبز رنگ کی لائٹ جلتی ہے آپ وہاں پہنچ کر گاڑی پارک کر سکتے ہیں ۔ ہر جگہ پر pillers لگے ہیں جن پر نمبر لگا ہے۔ جس کی تصویر آپ کھینچ کر اپنے موبائل

میں رکھ سکتے ہیں کہ آپ نے اپنی گاڑی کس منزل پر کس نمبر پر رکھی ہے۔اگر یاد نہ رہا تو ڈھونڈتے رہیئے۔ان منزلوں کو یہاں لیول کہتے ہیں۔بس یہ یاد رکھنا ہے کہ کس لیول میں گاڑی رکھی ہے۔مال میں کون سی چیز کہاں پر ملے گی اس کا اندازہ لگانا بہت ہی مشکل ہے۔اگر آپ کے ساتھ وہاں کا کوئی ساتھی ہے تب چیزیں ملنے کا امکان ہے۔اگر نہیں تو آپ چلتے رہیں، دیکھتے جائیں اور ٹرالی میں بھرتے جائیں، نکلتے وقت اپنا بل ادا کریں اور اور سب چیزیں گھر لے جائیں۔

تھک گئے تو مساج کی کرسیاں آپ کے انتظار میں ہیں۔ادھر آپ نے ایک رنگیٹ ڈالا ادھر آپ کی مساج کرسی تیار ہے کہ آپ کو مساج دے۔اور وہ اس طرح کام کرتی ہے جیسے چار چار نوکر آپ کے پاؤں اور کمر دباتے ہیں اور پاؤں پر بھی خوب مساج کرتے ہیں۔اگر اس سے بھی دل نہیں بھرا تو مساج سنٹر بھی موجود ہیں۔پاؤں کا مساج، ٹانگوں کا مساج، کمر کا مساج، بازو کا مساج، کندھوں کا مساج یا پھر پورے جسم کا مساج بھی ملتا ہے جس سے آپ پھر موم کی طرح پگھل کر ساری تھکاوٹ بھول کر گھر کا راستہ لیتے ہیں۔مال سے آنے اور واپس جانے میں کہیں کہیں فلائی اوور بھی بنے ہیں جو صرف اور صرف مال میں جانے اور وہاں تک گاڑی لے جانے کے لئے ہیں۔

ملیشیا کی صفائی ستھرائی بھی کمال حد تک ہے۔جہاں ہم رہتے تھے جیسے کہ کہا گیا کہ پاگو جیا کہلاتا ہے۔وہ شہر سے کچھ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔وہ ایک گاؤں ہے مگر ان کا گاؤں ہمارے شہروں سے زیادہ صاف وشفاف ہے۔وہاں ہر سہولت میسر ہے۔رات دن پانی چلتا ہے اور بجلی کی تو بات ہی نہیں، بھولے سے بھی نہیں جاتی۔ابھی تو یہ علاقہ ڈیولپ ہی ہو رہا ہے۔ابھی وہ سڑکیں ایسی نہیں ہیں کہ ان میں منہ نظر آئے۔مگر سٹریٹ لائٹس کا وہاں ایسا انتظام ہے جو ہم نے خواب میں بھی نہیں

دیکھا ہے۔ ہر گھر کے گیٹ کے باہر ایک بڑا سا ڈسٹ بن ہے جس کے نیچے سے ویل لگے ہیں اور اوپر سے ڈھکن ہے۔ ہر دن صبح سویرے مونسپلٹی کی گاڑی آتی ہے جس میں ان کے دو مددگار ہوتے ہیں۔ وہ ان میں سے پلاسٹک کو الگ کرتے ہیں اور کوڑے دانوں کو گاڑی تک پہنچاتے ہیں۔ پھر گاڑی ان کو آٹومشین سے اٹھاتی ہے اور خالی کرتی ہے اور واپس نیچے رکھتی ہے۔ مددگار پھر سے ان کو گھر کے باہر رکھتے ہیں۔

ملیشیا میں سکون کے ساتھ بیٹھے ہوئے سارا دن موسم اور ہواؤں کا لطف لیتے ہیں۔ گرمی بھی کیسی کہ دھوپ سے سر جلتا ہے نہ انسان پسینے سے شرابور ہوتا ہے۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ، ابھی دھوپ ہوئی نہیں کہ بادل کا ایک ٹکڑا آ گیا اور اس نے گرمی کا رُخ بدل دیا۔ اسی کے ساتھ ہوائیں چلتی ہیں اور ہوائیں بھی ایسی کہ مردے کے جسم میں بھی تازگی پیدا کرتی ہیں۔ شام ہوئی نہیں کہ بارش ہونے لگی اور بارش کی رفتار ایسی کہ سڑک کے آر پار بھی کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ سڑکوں میں اس قدر پانی بھر جاتا ہے کہ چلنے کی مہلت نہیں ملتی۔ مگر بارش بند ہوئی نہیں کہ سڑکیں صاف، شفاف اور دھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ پانی کہاں جاتا ہے زمین نگل جاتی ہے یا آسمان اڑا لے جاتا ہے معلوم نہیں ہوتا۔ اس روز روز کی بارشوں کی وجہ سے ہر طرف سے ہریالی ہی ہریالی ہے۔ سب باغ اور درخت سرسبز اور شاداب نظر آتے ہیں۔ ہر وقت ہر درخت ہو یا بیل بوٹا بشاشت لئے ہوئے ہے۔

سڑکوں پر ہر طرف گاڑیاں نظر آتی ہیں اور وہ بھی ہوا سے باتیں کرتی ہوئیں۔ ایک سو پچاس کی رفتار پر چلنے والی گاڑیاں اور ہر سڑک پر چار چار اور چھ چھ لین بنی ہیں جن پر گاڑیاں ٹریفک لائٹوں کے حکم سے چلتی ہیں۔ کوئی پولیس والا ٹریفک کو نہیں روکتا۔ لال بتی کے جلتے ہی ساری آمد و رفت بند ہو جاتی ہے۔ ایک طرف سے لائٹ سبز ہوئی تو گاڑیاں دوڑنے لگتی ہیں اور پھر ایک طرف پیدل والوں کے لئے

ہاتھ کا اشارہ ملتا ہے جہاں صرف پیدل والے ہی سڑک پار کر سکتے ہیں۔ ہر گاڑی کی اپنی رفتار ہے۔ مجال ہے کی کوئی گاڑی لال بتی کو کراس کرے اور جلدی سے نکل جائے اور وہ کسی کی نظر میں نہ آئے۔ کیمرے لگے ہیں اور ہر کیمرہ تصویر کھینچتا ہے۔ چاہے کسی کی رفتار زیادہ ہو یا کسی نے کوئی غلط کام کیا۔

فجر کی نماز کے بعد مونسپلٹی کی گاڑی آتی ہے اور سڑکوں کی صفائی کرتی ہے۔ ان کی سڑکوں پر غلاظت، کاغذ اور پلاسٹک بیگ نہیں ہوتے ہیں بلکہ گرد غبار کا بھی شائبہ نہیں ہوتا۔ گاڑیاں عادتاً صبح سویرے آتی ہیں ڈسٹ بن جو بھر بھر کے ہوتے ہیں ان کو صاف کر کے جاتی ہیں اور پھر ایک ایسی گاڑی آتی ہے جو سڑکوں کو Vacuum کرتی ہے تا کہ اگر کہیں گرد وغبار ہو بھی وہ ختم ہو جائے۔

یہاں لوگوں کو سڑکوں پر نہیں دیکھا جاتا ہے کیونکہ سڑکیں صرف گاڑیوں کے لئے ہیں۔ پیدل چلنا تو یہاں شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ ہاں اگر آپ کو یہاں کے لوگوں سے ملنے کی ازحد خواہش ہے تو کسی مال میں چلے جائیں جہاں شہر میں ملنے والی ہر چیز، ہر ضرورت کا سامان آپ کے لئے میسر ہوگا۔ سونے کی انگوٹھی سے لے کر باورچی خانہ کے برتنوں اور جھاڑو تک جو بھی نام آپ لیں گے وہ سب ایک ہی چھت کے نیچے ملے گا۔

یہ مسلمان ملک ہے، زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے اور حکومت بھی مسلمان ہے۔ یہاں ہر طرف حلال بکتا ہے۔ دکانوں اور مارکیٹوں اور بڑے بڑے مالوں میں ہر چیز پر حلال کی مہر لگی ہے۔ یہاں تک کہ استعمال ہونے والی اشیا اور میک اپ سامان پر بھی۔ یہاں کے لوگ بہت اچھے اور بھولے بھالے ہیں۔

☆☆☆

☆......ڈاکٹر ایم۔اے۔حق

افسانچہ کیا ہے؟

افسانچے کو سمجھنے سے پہلے ہمیں لازمی طور پر افسانے کو سمجھنا ہوگا۔ کیوں کہ جس قلم کار نے دانستہ وغیر دانستہ طور پر اس صنف کی ایجاد کی تھی وہ صحیح معنوں میں ایک افسانہ نگار تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے ریڈیو ڈرامے، ذاتی خاکے، فلم اسکرپٹ رائٹنگ، مضامین وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی تھی۔ لیکن کامیابی اور شہرت انھیں افسانہ اور افسانچہ نگاری میں ہی ملی ہے۔

جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے۔ میں سعادت حسن منٹو کی ہی بات کر رہا ہوں۔ لگے ہاتھوں میں یہ بات بھی ظاہر کر دوں کہ انھوں نے کسی منصوبہ بندی کے تحت افسانچہ نگاری (حالانکہ لفظ ''افسانچہ'' عظیم افسانچہ نگار جوگندر پال کی دین ہے) کی بنیاد نہیں ڈالی تھی۔ تو پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر افسانچہ کیوں کر صفحۂ قرطاس کی زینت بنا۔ اس لئے میں یہاں ان واقعات اور حالات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن سے متاثر ہو کر انھوں نے مختصر ترین ادبی پاروں کی تخلیق کی تھی۔ اس حقیقت سے شاید ہی کوئی اردو ادیب یا اس کا طالب علم ناواقف ہوگا کہ منٹو کی زندگی مالی مشکلات سے بھری پڑی تھی۔

منٹو نے جھنجھلاہٹ، غصّہ، بے چینی، گھبراہٹ، صدمے اور تحت الشعور میں رینگتے خوف کی وجہ سے مختصر اور مختصر ترین تحریریں یعنی افسانچے تخلیق کئے۔ ۳۲ افسانچوں پر مشتمل ''سیاہ حاشیے'' اکتوبر ۱۹۴۸ کو شائع ہوا تھا۔

میں یہ بات اس لئے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اُن کے لگ بھگ سارے افسانچے ہندو مسلم فساد، لوٹ مار، ہنگامے، آگ زنی، طنز، نفرت سے لبریز ہیں۔ اُنھوں نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ شدّت جذبات سے مغلوب ہوکر تحریر کئے گئے ان کے مختصر مختصر افسانے مستقبل میں کبھی افسانچے نام کی صنف سے پکارے جائیں گے جو رفتہ رفتہ ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں ایک مقبول صنف کی شکل اختیار کرلیں گی۔

مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ اتنی مقبولیت کے باوجود ہمارے تنقید نگاروں نے ابھی تک اس صنف کو قابل تنقید نہیں سمجھا ہے۔ ہاں! یہ بات صحیح ہے کہ دور حاضر میں منی کہانیوں، افسانچوں، منی افسانوں، مختصر مختصر کہانیوں، کہانچیوں کی جیسے ایک جھڑی سی لگ گئی ہے۔ نئے پُرانے لکھاری حضرات اس صنف پر دھڑلے سے طبع آزمائی کررہے ہیں۔ اب تک سینکڑوں مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ اس صنف کی مقبولیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بیشتر رسائل واخبارات مختصر تحریروں کو بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ کچھ قلم کاروں نے اسے تخلیق کا ایک سہل طریقہ سمجھ لیا ہے اور راتوں رات مقبول ہونے کے چکر میں لطیفہ گوئی، ہم کلامی (مونو لاگ)، ڈائیلاگ، (صرف سوال جواب)، حکایتوں، محاوروں کا بھی بے دھڑک استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔ چونکہ صحیح معنوں میں افسانچہ نگاری یا منی کہانی کی بُنت ایک مشکل ترین صنف ہے۔ اس میں وہی لکھاری کامیاب ہوسکتے ہیں جن کو کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتوں کو سمیٹنے کا شعور حاصل ہو۔ عنوان کی موزونیت کو پرکھنے کا سلیقہ معلوم ہو، غیر متوقع اختتام کے ذریعہ قارئین کو چونکا دینے کے ہنر سے واقفیت ہو۔ بہت کم قلم کار ایسے ہیں جن میں مندرجہ بالا خصوصیتیں یکجا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ناکامیوں کا زہر اس صنف کی

تنقیص کی شکل میں اُگلتے ہیں اور متعصب حضرات کو مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس صنف کے رموز واوقاف سے بے بہرہ ہمارے یہ ناقص افسانچہ نگار یا منی کہانی کار!!! حالانکہ انھیں (متعصب ناقدوں کو) یہ سوفی صد حق ہے کہ وہ ویسے افسانچہ نگاروں کی افسانچہ نگاری پر انگشت نمائی کریں لیکن وہ ایسا نہیں کریں گے۔ وہ اپنی بھڑاس نکالیں گے اس صنف کو ہی تنقید کا نشانہ بنا کر! بہت سی واہیات غزلیں و نظمیں، ناقص افسانے آئے دن مختلف رسائل و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں، کیا آج تک کسی ناقد کی یہ ہمّت ہوئی ہے کہ وہ صنف غزل و نظم گوئی، یا افسانہ نگاری کے وجود سے ہی منکر ہو جائے۔ ہاں! اتنا ضرور ہوا ہے کہ جو ایک بڑی کھائی افسانچوں اور تنقید نگاروں کے درمیان حائل تھی وہ اب رفتہ رفتہ سمٹتی جا رہی ہے۔

ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ افسانچہ، افسانہ نگار کے ذہن میں پنہاں افسانے کے رموز واوقاف کے لبادھے کو اوڑھ کر عالم وجود میں آیا ہے۔ ایسے خیالات کا اظہار ہمارے کئی دوستوں نے کیا بھی ہے کہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہی ایک اچھا افسانچہ نگار بن سکتا ہے۔ میں اس منطق سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتا ہوں لیکن انکار بھی ممکن نہیں۔ مثلاً محمد بشیر مالیرکوٹلوی، نورشاہ، دیپک بدکی، سرور غزالی (جرمنی)، پروفیسر اسلم جمشید پوری، پرویز بلگرامی (کراچی)، امجد مرزا امجد (لندن)، اشتیاق سعید، ویریندر پٹواری، پروفیسر رؤف خوشتر، راجہ یوسف، سید نورالحسنین، مشتاق احمد نوری، ایم۔ مبین، ابرار مجیب، احمد کلیم فیض پوری، شاز یہ ستّار نایاب (لاہور)، جاوید نہال حشمی وغیرہ نے کامیاب افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین افسانچے بھی لکھے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ سیّد نورالحسنین، ابرار مجیب، اشتیاق سعید، مشتاق احمد نوری وغیرہ کے افسانچوں کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن جتنے بھی ہیں ان میں معیاری افسانچوں کا تناسب قابلِ تعریف ہے۔ دوسری طرف میں بہت سے ایسے افسانچہ نگاروں کو جانتا

ہوں جنہوں نے اس صنف میں اچھا خاصا نام کمایا ہے جبکہ افسانہ نگاری میں وہ اتنے کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ مثلاً مظفر حنفی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ایم۔اے۔حق، ڈاکٹر عظیم راہی، رونق جمال، وکیل نجیب، ڈاکٹر نخشب مسعود وغیرہ۔مندرجہ بالا باتوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک اچھا افسانہ نگار ہی ایک کامیاب افسانچہ نگار نہیں بن سکتا ہے۔

کچھ ایسے بھی افسانہ نگار ہیں جن کی عظمت اور شہرت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اُن کے افسانے ملک و بیرون ملک میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں لیکن ان کے افسانچوں نے ویسی کامیابی حاصل نہیں کی جیسے سلام بن رزاق، خورشید حیات وغیرہ۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم بلا جھجھک یہ کہہ سکتے ہیں کہ افسانچے کی کامیابی کا انحصار اس کی تکنیک کی جانکاری پر ہے۔ اگر کوئی معیاری افسانہ نگار اس تکنیک سے واقف ہے تو بلا شبہ وہ ایک اچھا افسانچہ نگار بن سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اوسط درجے کا افسانہ نگار افسانچے کے رموز و اوقاف سے بھلی بھانتی واقف ہے تو اُس کو ایک بہترین افسانچہ نگار بننے سے کون روک سکتا ہے؟

جہاں تک افسانچے کی طوالت کا تعلق ہے، مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ آخر لوگ افسانچے کی ہی کتر بیونت کے لئے کیوں تُلے ہوئے ہیں۔ اُردو ادب میں اور بھی نثری اصناف ہیں لیکن میں نے تو کبھی کسی کو داستان کی لمبائی کو محدود کرتے، ناول کی طوالت کو قید کرتے، افسانے کے صفحات طے کرتے، انشائیے پر قدغن لگاتے، مضامین کے سائز پر فیصلہ صادر کرتے نہیں دیکھا ہے تو پھر یہ افسانچے پر ہی توجہ چہ معنی دارد؟

جہاں تک منٹو کا سوال ہے تو انھوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک نئی

صنف کی ایجاد کرنے جارہے ہیں۔ان کے ''سیاہ حاشیے'' کے ۲۳ افسانچوں پر جب ہم طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ اس میں الہنا ڈیڑھ لائن، قسمت ۲ لائین، آرام کی ضرورت ۲ لائین، رعایت ۲ لائین، سوری ڈھائی لائین، صدقے اس کے ڈھائی لائین، خبردار ۳ لائین، دعوتِ عمل ۳ لائین، آنکھوں پر چربی ساڑھے ۳ لائین سے لے کر اشتراکیت ۷ لائین، پیش بندی ۶ لائین، نگرانی میں ۸ لائین، ہوتے ہوئے تقسیم ۴۲ لائین، مزدوری ۶۵ لائین اور تعاون ۸۵ لائین کی کہانیاں موجود ہیں۔ یعنی اُن کی نگاہ میں ایسی تحریروں کے لئے کسی قسم کے ضابطے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ چونکہ یہ مختصر کہانیاں اُن کے غم و غصّے کا اظہار یہ تھے اس لئے اُن کے دل و دماغ اور ذہن میں جن خیالات کی یلغار ہوتی رہی وہ صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتے گئے۔اُس وقت تک منٹو کافی افسانے لکھ چکے تھے۔اس لئے ہم یہ تو بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ اُن افسانوں کی بہ نسبت یہ تحریریں چھوٹی ضرور تھیں۔تو یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ افسانچہ چھوٹا ہونا چاہیے۔ سیاہ حاشیے کی کچھ کہانیوں کو چھوڑ کر جیسے تقسیم، مزدوری، تعاون وغیرہ۔اب سوال اُٹھتا ہے کہ یہ کتنا چھوٹا ہونا چاہیے۔میرے خیال میں افسانچے میں مختصر کرتے رہنے کے عمل کو تب تک جاری رکھنا چاہیے جب تک اس سے ابہام کی بُو نہ آنی شروع ہو جائے۔اس اصول کو ذہن نشیں کر لیں کہ تفصیل کے زائد ایک جملے پر بھی طوالت کا الزام لگ سکتا ہے۔بس یہی افسانچے کی لمبائی کا stick Yard ہوسکتا ہے۔یعنی اتنا طویل نہ کریں کہ بے جا طوالت کا طوق لٹک جائے اور نہ اتنا مختصر کریں کہ ابہام کا خطرہ منڈلانے لگے۔افسانچہ جتنا مختصر ہوگا اتنا کامیاب ہوگا۔

''افسانچہ'' دراصل افسانے کی بونسائی (Bonsai) شکل ہے۔ یہ ایک جاپانی ہنر ہے جس میں بڑے بڑے پیڑوں کو انتہائی چھوٹی شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے۔یہ ایک منفرد تکنیک ہے جس میں فنی مہارت، ذہانت، لگن، مشقت اور جاں فشانی

کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی قیمتیں آسمان کو چھوتی ہیں اور یہ بڑے رئیسوں، امیروں، نوابوں، دولت مندوں کے ڈرائینگ روم کی زینت بنتے ہیں۔ آپ لوگوں نے ایسی جگہوں پر برگد، پیپل، آم، اِملی کی چھوٹی شکلیں ضرور دیکھی ہوگی جن کے تمام اجزا پیڑوں جیسے ہی ہوتے ہیں، لیکن ان کی جسامت ان پیڑوں کی بہ نسبت بہت چھوٹی ہوتی ہے جس طرح ''بونسائی'' کا بنانا بہت آسان کام نہیں ہے، ٹھیک اسی طرح ہر قلم کار کے لئے ''افسانچے'' تحریر کرنا ممکن نہیں۔ اس میں بھی افسانے کے تمام لوازمات موجود رہنے کے باوجود یہ بہت مختصر سی تصنیف نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے فنّی مہارت، ذہانت، محنت، لگن، افسانچے کی تکنیک سے واقفیت، الفاظ پر پورا کنٹرول ہونا لازمی ہے۔ اس لئے افسانے کے اجزائے ترکیبی جیسے پلاٹ، کردار، مکالمے، کلائمکس، پیغام وغیرہ کو نہایت فنّی چابک دستی سے افسانچے کی شکل میں ترتیب دی جاتی ہے۔

یہ بات اب واضح ہوگئی ہے کہ افسانچے کے لئے اختصار کی کیا اہمیت ہے۔ لیکن اس اختصار کو سطور اور صفحات میں قید کرنا مناسب نہیں۔ میرے خیال میں کہانی پن کے لبادھے میں پیغام کی مکمل ترسیل جس میں تکرار، غیر ضروری مکالمے اور تفصیلات کی عدم موجودگی کے ساتھ ساتھ اختصار کو برتنے والے Appropriate الفاظ کی ادائیگی کا سلیقہ بھی ہو۔ یہ افسانچے کی ساخت کے لئے ضروری ہے۔

کسی لفظ یا جملے کا بار بار استعمال تکرار کہلاتا ہے۔ ایک نمونہ یہاں پیش خدمت ہے:

> ''بڑی بھابی کا موڈ آج کچھ اُکھڑا ہوا تھا۔ بڑے بھیّا
> حسبِ معمول خاموش تھے۔ وہ کرتے بھی کیا۔ بڑی بھابی تھیں
> ہی بد دماغ۔ جس دن سے بڑی بھابی شادی کر کے اس گھر میں

آئی ہیں، گھر کا ماحول ہی بدل گیا ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ بڑی بھابی کا موڈ اُکھڑا ہوا ہے تو چپ چاپ گھر سے باہر نکل گیا۔''

اس نمونے میں تکرار کی بھر مار ہے۔ ایک کامیاب افسانچہ نگار اسے یوں لکھے گا۔

''بڑی بھابی کا موڈ آج کچھ اکھڑا ہوا تھا۔ (بڑے) بھیّا خاموش تھے۔ وہ کیا کرتے (بڑی بھابی) وہ تھیں ہی بد دماغ۔ جس دن سے (بڑی بھابی) وہ شادی کر کے اس گھر میں آئی ہیں۔ گھر کا ماحول ہی بدل گیا ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ (بڑی بھابی کا موڈ اُکھڑا ہوا ہے) ان کا مزاج بگڑا ہوا ہے۔ تو چپ چاپ گھر سے باہر نکل گیا۔

غیر ضروری مکالمے کی مثال دیکھیے:

''کال بیل کی گھنٹی بجی۔ ایک بزرگ شخص نے سخت ناگواری کی حالت میں دروازہ کھولا۔ سامنے اپنے بیٹے شاہد پر نظر پڑتے ہی وہ غصّہ سے اُبل پڑے ''کہاں گئے تھے اتنی رات کو؟ جانتے ہو ابھی کتنا بجا ہے؟''

شاہد خاموش کھڑا رہا۔

''اب بولتے کیوں نہیں؟ ساتھیوں کے ساتھ فلم دیکھ کر آرہے ہو گے؟ کچھ تو شرم کرو، اگلے ماہ تمہارا فائنل ایگزام ہے۔ ایک بار تو فیل ہو ہی گئے ہو۔ کب تک یہ سب چلتا رہے گا۔'' شدتِ جذبات سے وہ کانپ رہے تھے۔

''اب ایسی غلطی نہیں ہوگی پاپا۔۔۔معاف کر دیجیے''

شاہد کے لہجے سے ندامت ٹپک رہی تھی۔

''ٹھیک ہے جاؤ۔۔کچن میں کھانا گرم کر کے کھالو۔''

مندرجہ بالاتحریرافسانے کے لئے موزوں ہے نہ کہ افسانچے کے لئے۔ایک اچھاافسانچہ نگاراس کوایسے برتے گا۔

''دیر رات کوفلم کا آخری شو دیکھ کر لوٹے شاہد کو اُس کے ضعیف باپ نے خوب ڈانٹ پلائی۔'' کچھ تو شرم کرو۔اگلے ماہ فائنل ایکزام ہے۔ایک بارتو فیل ہو ہی گئے ہو۔کب تک یہ سب چلتا رہے گا۔''

نادم شاہد کے معافی مانگنے پر کہ وہ اب ایسی غلطی نہیں کرے گا،اُس کے باپ نے اسے کچن میں رکھے کھانے کوگرم کر کے کھانے کی ہدایت کی۔

دیکھا آپ نے 120 الفاظ پرمشتمل افسانچے کےلحاظ سے غیر ضروری مکالمے کوکس خوبصورتی سے صرف 74 الفاظ میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

اب ہم چلتے ہیں''غیرضروری'' تفصیلات کی طرف:

''مئی کا مہینہ تھا۔سخت گرمی پڑ رہی تھی۔اُس کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔گرم ہوا کے جھونکے اُس کے چہرے کو جھلسا رہے تھے۔ہونٹوں پر پپڑ یاں جمی ہوئی تھیں۔ پیاس کی شدت سے گلے میں کانٹے پڑ رہے تھے۔چاروں طرف ہوکا ماحول تھا۔''

افسانچے میں اتنی تفصیلات کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔مندرجہ بالا تفصیلات کومختصر شکل میں اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔

’’مئی کا مہینہ تھا۔ شدّت کی گرمی پڑ رہی تھی‘‘ ایک ذہین قاری کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ وہ اپنی تصور کی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ مئی کے مہینے میں جب شدّت کی گرمی پڑ رہی ہوتی ہے تو ضرور اُس (افسانچے کے کردار) کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا ہوگا، گرم ہوا کے جھونکے سے چہرہ جھلس گیا ہوگا، ہونٹوں پہ پپڑ یاں جمی ہوں گی، پیاس کی شدت سے گلے میں کانٹے پڑ گئے ہوں گے۔ یہاں افسانچہ نگار کو اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی باتیں بے جا طوالت کا محرک بنتی ہیں۔

ایک کامیاب افسانچہ نگار کے پاس الفاظ کا ذخیرہ تو ضرور ہونا چاہیے۔ تب ہی وہ طوالت کو قید کر سکے گا۔ لمبے جملے یا مخلوط الفاظ کے لئے ایک لفظ کی جانکاری افسانچہ نگار کو ہونی چاہیے۔ جیسے:

’’اتنے میں لاش لے جانے والی گاڑی بھی وہاں پہنچ گئی‘‘۔ (گیارہ الفاظ)

’’اتنے میں ایمبولینس بھی وہاں پہنچ گئی‘‘ (سات الفاظ) یہاں ’’لاش لے جانے والی گاڑی‘‘ پانچ الفاظ کے لئے اس کا متبادل ایک لفظ ’ایمبولینس‘ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح ’چھپی ہوئی‘ کی جگہ ’پوشیدہ‘ ’ماں باپ‘ کی جگہ ’والدین‘ وغیرہ لکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ ہاں! کردار کی مناسبت اور واقعہ کی نوعیت کے مطابق مخفف الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرنے کی صلاح دی جاتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ افسانچہ نگار کو نہایت باریکی سے افسانچے کو مختصر کرنے کی تراکیب اپناتے ہوئے کہانی کے زائد الفاظ یا جملے کو کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

طوالت کے اختصار کے لئے ایک دل چسپ مثال پیش کی جاتی ہے، جسے آپ لوگوں نے کبھی نہ کبھی ضرور دیکھا ہوگا۔ ایک راج مستری (Mason، جو اینٹ اور گارے کی مدد سے دیواریں کھڑی کر کے اُس پر پلاسٹر بھی چڑھاتا ہے) سمینٹ اور بالو کے Mixture کو اپنی ’کرنی‘ (ایک اوزار جس کی مدد سے وہ پلاسٹر کا کام کرتا

ہے) سے دیوار پر مسالہ چڑھاتا ہے۔ جب کافی مقدار میں سیمنٹ اور بالو دیوار پر لتھیڑ دی جاتی ہے تو وہ اپنے گتّے (ایک اوزار) کی مدد سے زائد اور بے ترتیب سیمنٹ کو گراتا جاتا ہے، جب تک کہ دیوار یکساں طور پر خوبصورت نظر نہ آنے لگے۔ یہی ترکیب افسانچہ نگار حضرات کو بھی اپنانی چاہیے۔ پہلے وہ اپنے پلاٹ پر الفاظ اور جملوں کا مکسچر لتھیڑ دے۔ پھر اپنی فنی چابکدستی اور اپنے Skillful endeavour کے گتّے کا استعمال کر زائد الفاظ اور جملوں کو تب تک سیمنٹ کی طرح گراتا جائے (مختصر کرتے ہوئے) جب تک خوبصورت دیوار کی طرح ایک خوبصورت افسانچے کی تعمیر نہ ہو جائے۔ زائد الفاظ اور جملوں کے تخفیف کرنے کا سلسلہ تب تک چلانا چاہیے کہ اگر مزید ایک لفظ یا جملہ کم کیا گیا تو ابہام پیدا ہو جائے اور اگر ایک لفظ یا جملہ نہیں کم کیا جائے تو غیر ضروری طوالت کا الزام لگ جائے۔ مندرجہ بالا اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اگر ۲۱ سطور پر مشتمل کوئی افسانچہ (یہ صرف ایک مثال ہے) لکھا جائے تو وہ ایک کامیاب افسانچہ ہوگا۔ ہاں! اب اگر مذکورہ افسانچے میں کچھ الفاظ یا جملے کی تخفیف کر کے اسے ۹ سطور پر لایا جائے تو ۲۱ سطور والا وہ افسانچہ غیر ضروری طوالت کا شکار کہلائے گا۔ خیال رہے کہ اتنا ہی مختصر کیا جائے جس سے افسانچے کے پیغام کی ترسیل اور کہانی پن مجروح نہ ہونے پائے۔ کہانی پن افسانچے کی روح ہے اور مجھے کہنے دیجیے کہ آج کل کے بیشتر افسانچے اس روح سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ افسانچے کا سب سے بڑا وصف اس کا اختصار ہے۔ میں یہاں چند تراکیب بتانا چاہوں گا جن کی مدد سے کوئی افسانچہ نگار کسی طویل تخلیق کو کس طرح اختصار کے ساتھ قلم بند کر سکتا ہے۔

☆ آپ اخبار کی کسی خبر (جو لگ بھگ 12-10 سطور پر مشتمل ہو) کا بغور

مطالعہ کریں۔ پھر کم سے کم الفاظ میں اسے لکھنے کی کوشش کریں۔لیکن شرط یہ ہے کہ خبر کی کوئی اہم بات چھوٹنے نہ پائے۔

☆اپنا ہی کوئی طویل افسانچہ آپ اس کے لئے منتخب کر سکتے ہیں۔ جب آپ اس مضمون کی روشنی میں تخفیف کا قاعدہ اپناتے ہوئے اسے مختصر کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے تو یقین مانیں آپ کو بے انتہا خوشی محسوس ہوگی۔

☆اگر آپ کا کوئی افسانچے کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے تو آپ اپنے طویل افسانچوں کو مختصر کر کے اسے اپنے دوسرے ایڈیشن میں لگا سکتے ہیں۔اس سے آپ کے افسانچوں کا معیار کافی بلند ہوجائے گا۔

☆یہ تجربہ آپ کسی دوسرے کے طویل افسانچوں یا منی کہانیوں پر بھی کر سکتے ہیں۔

میرا یہ مشورہ کچھ افسانچہ نگاروں کو ناگوار گزر سکتا ہے لیکن اس بات کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی ہے کہ میں ابھی بھی اس process پر عمل کرتا ہوں۔

اس لئے افسانچہ نگاروں کو چاہیے کہ وہ اپنے علاقے میں اس طرح کی کوئی تنظیم بنائیں جہاں افسانچہ نگار جمع ہوکر ایک دوسرے کے افسانچوں پر بے لاگ اور بے باک تجزیئے پیش کریں۔میری نظر میں سارے ہندوستان میں اس طرح کی ایک ہی تنظیم ہے جو''افسانہ کلب'' کے نام سے مالیر کوٹلہ (پنجاب) میں واقع ہے۔

افسانچے کا اختتام اس کی پونجی ہے جس طرح مناسب وقت پر پونجی کا صحیح استعمال قابل تعریف بات سمجھی جاتی ہے۔اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کی سگائی میں کافی مال و دولت کی نمائش کرتا ہے اور شادی بالکل سادگی سے انجام دیتا ہے تو لوگوں کو یہ عمل متاثر نہیں کرتا ہے۔اس لئے ایک کامیاب افسانچہ نگار کو چاہیے کہ وہ کلائمکس کی پونجی کو بچا کر

رکھے اور صحیح وقت پر اس کا استعمال کرے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ ایک مختصر سی تحریر میں وہ کون سی صفت ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ زبان و بیان کی لطافت، مکالمے کی اہمیت، جذبات کی جزئیات نگاری اور تفصیلات کی چاشنی یہ سارے افسانے کی خصوصیات ہیں۔ ان کا افسانچے میں کوئی کام نہیں بلکہ ان کی موجودگی افسانچے کو بے جا طوالت کی دلدل میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔ بس ایک اختتام ہی وہ پونجی ہے جو کسی افسانچے کو ابدیت بخشتی ہے۔

اب ہم افسانچے کے عنوان کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ اگر کسی افسانچے کو مکمل کرنے میں تین گھنٹے لگتے ہیں تو اُس کے عنوان کا انتخاب تین سے زائد گھنٹوں میں کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ذہن نشیں کرنی چاہیے کہ عنوان ایسا کبھی نہ رکھیں کہ جس سے اختتام کا پتا چل جائے بلکہ اس کی بھنک بھی قاری کو محسوس نہ ہو سکے۔ اگر کوئی افسانچہ نگار ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو قاری کو افسانچے کا اختتام ''غیر متوقع'' معلوم ہوگا۔ ایسی حالت میں قاری کو افسانچہ پسند کرنے سے کون روک سکتا ہے؟

اب اگر کوئی مجھ سے مختصر میں افسانچے کی تعریف پوچھے تو میرا جواب ہوگا :

''غیر ضروری تفصیلات، مکالمے اور تکرار سے بچتے ہوئے،
قارئین تک افسانے کے پیغام کی ترسیل کرتے ہوئے، کہانی پن
کو مجروح کئے بنا، بونسائی کی طرز پر افسانے کے تمام لوازمات کو
سمیٹتے ہوئے وجود میں آنے والی تحریر کو ''افسانچہ'' کہتے ہیں۔''

☆☆☆

☆......محمد فاروق

افسانچہ نگاری کے خدوخال

اردو میں نظم کی طرح نثر میں بھی بالخصوص فکشن تخلیق کرتے وقت فنّی اسرار و رموز کا پاس رکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔اس طرح ہم کسی بھی نثر پارے کو اُس وقت تک فکشن کے کسی زمرے میں شامل نہیں کر سکتے جب تک وہ فکشن کے فنّی تقاضوں کو پورا نہ کرے۔فکشن کی مختلف اصناف کے لیے دانشوروں، اہلِ قلم حضرات اور محققین و ناقدین نے کچھ اجزا مقرر کیے ہیں جن کا اُس نثر پارے میں پایا جانا لازم وملزوم ہے۔

اردو فکشن کئی صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ، مختصر کہانی سے ہوتے ہوئے آج افسانچے تک پہنچ گیا ہے۔ نتیجے کے طور پر سینکڑوں صفحات سے ہوتے ہوئے کہانی چند جملوں میں سمٹ گئی ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے خیال کو نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرنا، ساتھ ہی کہانی میں حسنِ بیان بھی برقرار رکھنا۔افسانچہ کہلاتا ہے۔افسانچہ قصّہ نگاری کی ایک نئی اور جدید ترین صورت ہے۔اصل میں افسانچہ افسانے کی ہیئت میں تبدیلی کا تجربہ ہے۔جس طرح ناول سے ناولٹ نکلا اسی طرح افسانے کے بطن سے افسانچے نے جنم لیا ہے۔

اصل میں افسانچہ، افسانے کا چھوٹا روپ ہے یعنی افسانے میں فکشن نگار کہانی انتہائی اختصار سے پیش کرتا ہے۔لیکن افسانچہ نگار نے یہ کام اس حسن وخوبی سے انجام دینا ہوتا ہے کہ مختصر افسانچے میں طویل افسانے کا تاثر برقرار رہے۔ بقول محمد بشیر مالیرکوٹلوی:

''جیسے صندوق سے صندوقچہ، کتاب سے کتابچہ اور افسانے سے افسانچہ یعنی افسانے کا چھوٹا سائز، سائز چھوٹا مگر تاثر ویسا ہی جتنا افسانے کا۔''

(افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں۔ص:129)

ڈاکٹر عظیم راہی افسانچے کی تعریف ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''افسانچہ ادب کی وہ نثری صنف ہے جس میں کم سے کم لفظوں میں کم سے کم سطروں میں ایک طویل کہانی مکمل کر لیں۔ افسانچہ زندگی کے کسی چھوٹے سے لمحے کی تصویر دکھا کر ایک قاری کے ذہن میں کام شروع کر دینے کا نام ہے۔''

(اردو میں افسانچے کی روایت: تنقیدی مطالعہ۔ص:59)

داستان، ناول اور افسانے کے اجزائے ترکیب غالباً ایک سے ہیں۔ لیکن افسانچے میں کہانی کے سائز کے ساتھ ساتھ اس کے اجزائے ترکیبی میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ فکشن کے بہت سے اہم اجزا افسانچہ نگاری میں استعمال نہیں ہوتے، کچھ کا استعمال نہ کے برابر ہوتا ہے۔ اس صنف کے اجزائے ترکیبی کا تعین بہت مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی نامور افسانچہ نگاروں اور ناقدین نے افسانچہ نگاری کے لیے مندرجہ ذیل اجزائے ضروری قرار دیے ہیں:

1۔ افسانچے کا سائز
2۔ موضوع
3۔ پلاٹ
4۔ منظر نگاری
5۔ جزئیات نگاری

6۔ کردار نگاری

7۔ مکالمہ نگاری

8۔ نقط عروج

9۔ اختتام یا انجام یا کلائمکس

10۔ زبان و بیان

آ یئے فکشن کی اس مختصر ترین صنف افسانہ نگاری کے فنّی لوازمات اور افسانچہ نگاری کے خدو خال کا جائزہ لیں۔

افسانچے کا سائز:

ظاہر ہے کہ افسانچہ فکشن کی سب سے مختصر ترین صنف ہے۔مرزا غالبؔ نے ایک خط میں مرزا علی بخش خاں کو لکھا تھا:

> ''چاہتا ہوں کہ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہہ دوں اور تحریر کو تقریر کا آئینہ بنا دوں۔''(خطوطِ غالب۔ص:۴۵)

ایجاد اور اختصار افسانچہ نگاری کا سب سے اہم اور لازمی جز ہے۔ ہم افسانچے کی جسامت اور سائز کو جملوں اور الفاظ میں مقرر نہیں کر سکتے۔مطلب اشعار کے اوزان اور بحروں کی طرح افسانچے کے لیے لفظوں اور جملوں کی تعداد مقرر نہیں کی جاسکتی۔کیوں کہ ہر واقعہ کا پلاٹ اور حادثے ،ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، کیوں کہ ہر کہانی میں کردار اور منظر نگاری وغیرہ ایک سی نہیں ہوتی۔اس لیے نثر کی دوسری اصناف کی مانند افسانچے کی جسامت اور سائز ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔اس ضمن میں فردوس احمد بھٹ رقم طراز ہیں:

> ''افسانچہ مختصر ترین کہانی کو کہتے ہیں جو کم سے کم الفاظ اور کم سے کم سطور میں بیان کی گئی ہو۔افسانچہ میں کرداروں اور مکالموں کو

زیادہ دیکھا نہیں جاتا ہے۔ کیوں کہ افسانچہ کا کینوس بہت ہی
چھوٹا ہوتا ہے۔ کہانی چند جملوں میں پیش کی جاتی ہے۔ اس لیے
واقعہ کو مختصر ترین صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔''

حالانکہ کچھ افسانچہ نگار، محقق اور مدیر افسانچے کے سائز کی حد کو مقرر کر کے اسے جملوں کی حد بندی میں قید کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مشہور فکشن نگار محمد بشیر مالیرکوٹلوی، افتخار امام (مرحوم) مدیر ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شاعر بمبئی کے مدیر جناب افتخار امام صدیقی نے افسانچے کا
ایک پیمانہ دیا تھا۔ افتخار بھائی ظاہر ہے بہت ذہین انسان ہیں اور
خود بھی افسانچے تخلیق کرتے ہیں۔ انہوں نے افسانچے کے
حروف کا پیمانہ باندھا تھا۔ الف سے لے کر یے تک افسانچے
میں سات حروف میں اف س ان چ ہ۔ بڑے سے بڑا افسانچہ
سات جملوں کا ہوسکتا ہے۔ بات دل کو لگتی ہے افسانچہ سات
لائنوں سے زیادہ اچھا نہیں لگتا میرا ماننا ہے کہ افسانچہ تین جملوں
تک محدود ہونا چاہئے۔ استاد منٹو نے منی کہانی کے سائیز کو بھی
سیاہ حاشیوں میں شامل کیا ہے۔ وہ اُس وقت کی بات تھی بہر
حال افسانچے کا سائیز چھوٹا ہو تو بہتر۔''

(افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں، ص:130)

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانچے کا سائز چھوٹا ہونا چاہیے۔ لیکن ہم اس کے سائز کو الفاظ اور جملوں کی کسی مخصوص حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم اب تک شائع شدہ افسانچوں کے مجموعوں کو دیکھیں تو ہمیں دو تین سطروں سے لے کر ایک صفحے تک کے افسانچے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں

کہ افسانچہ ایک صفحہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ کچھ لوگوں نے ماہنامہ 'شاعر' ممبئی میں یک لفظی افسانچے بھی لکھے تھے۔ جن کی سخت تنقید ہوئی۔ مثال کے طور پر اردو کے چند کامیاب افسانچے پیش کیے جا رہے ہیں۔ جس سے آپ کو افسانچے کی جسامت کا اندازہ ہو جائے گا۔

سوری

''چھری پیٹ چاک کرتی ہوئی ناف کے نیچے تک چلی گئی۔ ازار بند کٹ گیا۔ چھری مارنے والے کے منہ سے اچانک کلمہ تاسف نکلا۔ چ۔۔۔چ۔۔۔چ۔۔۔چ۔۔۔مشٹیک ہو گیا۔''

(افسانچہ نگار سعادت حسن منٹو)

مجرم

میری بیٹی ٹرین کے باتھ روم سے واپس آتے ہی مجھ سے بولی۔

''پاپا۔۔۔! آپ ابھی تک غلط ہندی لکھتے ہو اور میں۔۔۔

دوہری شرم میں ڈوب گیا۔

(افسانچہ نگار، ایم اے حق)

محلّے کے بچے

اُس کے بچّوں سے سارا محلّہ پریشان تھا۔

اُس نے تنگ آ کر اپنے بچّوں کو دینی مدرسے میں ڈال دیا۔

وہ فارغ ہو کر لوٹے تو سارا شہر پریشان ہے۔

(افسانچہ نگار، عارف خورشید)

موضوع:

افسانچہ نگاری میں موضوع کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم روزانہ

بہت سی فضول باتیں کرتے ہیں لوگ ان کو بے توجہی سے سنتے ہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ہم اگر کوئی عجیب وغریب بات کریں گے،سنسنی خیز واقعہ سنائیں گے تو لوگ اپنا کام چھوڑ کر ہماری بات سنیں گے اور اس بات پر ہمارے بعد بھی بحث ومباحثہ کریں گے۔بس افسانچہ کا موضوع بھی ایسا ہی ہو کہ جو اسے پڑھنے لگے اور پورا پڑھ کر ہی دم لے۔پھر پڑھنے کے بعد اپنے دوستوں سے اس کے متعلق تذکرہ کرے۔

کامیاب افسانچے کی ضمانت منفرد موضوع ہوتا ہے۔افسانچے کا موضوع اچھوتا ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد ہونا چاہئیے، پرانے اور گھسے پٹے موضوعات پر لکھے افسانچے کامیاب افسانچوں میں شمار نہیں ہوتے۔اس ضمن میں ایم۔اے۔حق میں رقم طراز ہیں:

''افسانے کا موضوع دورِ حاضر کے مسائل اور اس کی اِردگرد گردش کرنے والے حالاتِ زندگی کا عکس ہونا چاہئیے۔گھسے پٹے واقعات یا تفصیلات یا ٹاپک سے بچنا چاہیے۔

''(افسانچہ نگاری کا فن۔ص:18)

افسانچے میں موضوع کے نئے پن کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد بشیر مالیرکوٹلوی کچھ یوں لکھتے ہیں:

''موضوع عام یا گوروٹین کی بات ہو اس کی پیش کش،ایک ایسے پہلو کی پیش کش جس پر کسی کی نظر نہ گئی ہو۔اُس کو شاہ کار بنا دیتے ہیں۔موضوع افسانچے کی روح ہے اور روح کے بغیر انسان لاش کہلاتا ہے۔''

(افسانہ،افسانچہ تکنیکی تناظر میں۔ص:122)

اس کے ساتھ ہی حکایت، لطیفے اور اقوال زریں کو افسانچے کی شکل دینے

سے پرہیز کرنا بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ سبھی اصناف افسانچے کے فنّی اصول پر کھری نہیں اترتیں۔ لیکن بہت سے محققین و ناقدین نے خلیل جبران، ابراہیم جلیس اور شیخ سعدی کی تحریروں کو افسانچے کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ ان قلم کاروں کی یہ تحریریں افسانچہ نگاری کے ضمن میں شامل نہیں کی جاسکتیں کیوں کہ ان میں افسانچہ نگاری کی خوبیاں نہیں ہیں۔

اردو افسانچہ اپنے ادبی سفر کے غالبًا 70۔72 سال پورے کر چکا ہے اور آج ہر طرح کے موضوعات پر افسانچے لکھے جا رہے ہیں۔ جن میں قومی و بین الاقوامی سیاسی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی موضوعات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانچہ نگاری کی پہلی شرط یہ ہے کہ موضوع دھماکے دار، اچھوتا اور چونکا دینے ہو۔

پلاٹ:

افسانچہ فکشن کی ننھی سی صنف ہے جو چند جملوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں پلاٹ کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ افسانچے میں افسانے کی مانند زیادہ واقعات بھی نہیں ہوتے۔ لہٰذا افسانچے میں قلم کار کو چند جملوں میں ایک طویل کہانی کو پیش کرنا ہوتا ہے لیکن یاد رہے کہ اس چند جملوں کی کہانی میں طویل کہانی کا تاثر پوشیدہ ہونا چاہیے۔ قاری کو اس چھوٹی سی کہانی کو پڑھ کر کسی طرح کی تشنگی محسوس نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ اسے بھرپور کہانی کا مزہ آنا چاہیے۔ اس ضمن میں مشہور و معروف فکشن نگار جوگیندر پال لکھتے ہیں:

> ''منی افسانے کا کمال یہ ہوتا ہے کہ چند ہی سطروں میں قاری ایک طویل کہانی کا تانا بانا آپ ہی اپنے ذہن میں بُن لے۔''
>
> (اردو میں افسانچہ کی روایت: تنقیدی مطالعہ۔ص:49)

اصل میں افسانچہ کم سے کم لفظوں میں ایک طویل کہانی کی وحدت کا نام ہے۔ مطلب یہ کہ کم سے کم لفظوں میں لکھا گیا یہ افسانچہ خود بخود ہی قاری کے ذہن میں پھیل کر ایک طویل کہانی بن جائے۔ بہت سے افسانچے کے ناقدین کے مطابق ایک اچھا افسانہ نگار ہی ایک اچھا افسانچہ لکھ سکتا ہے۔ کیوں کہ افسانچہ، افسانے کی چھوٹی شکل ہے۔ اس حوالے سے معروف افسانہ نگار وافسانچہ نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی رقم طراز ہیں:

''ایک کامیاب افسانہ نگار ہی بہتر افسانچہ تخلیق کر سکتا ہے۔''

(افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں۔ ص:133)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو افسانچہ نگار، افسانے کی تکنیک اور لوازمات سے ناواقف ہو وہ اچھا افسانچہ نہیں لکھ سکتا۔ اس سلسلہ میں عبدالرحیم نشتر کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''افسانچہ وہی قلم کار لکھ سکتا ہے جس نے افسانہ کے رموز واسرار کو بہتر طریقے سے جانا، پرکھا اور برتا ہو۔ منی افسانہ نگاری انگلی سے پربت اُٹھانے کا فن ہے۔''

(ودربھ میں اردو افسانہ۔ ص:13)

بہت سے ناقدین کے مطابق افسانہ نگاری سے افسانچہ نگاری کہیں مشکل کام ہے۔ اصل میں افسانہ نگار کے پاس اپنی تخلیق کو خوب صورت بنانے کے بہت سے اوزار ہوتے ہیں۔ مثلاً حسب ضرورت کردار، کردار کے مزاج کے مطابق مکالمے، شعریت سے بھرپور منظر نگاری، جذبات نگاری اور جزئیات نگاری وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ اس کے مقابلے میں افسانچہ نگار کے پاس اوزار نہیں ہوتے۔ اسے کم سے کم الفاظ میں ہی طویل کہانی کا تاثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ افسانچے کے اختتام پر دھما کہ کرنا ہوتا ہے۔ چونکا دینے والی کیفیت پیدا کرنا ہوتی ہے۔

منظر نگاری:

صدیوں سے منظر نگاری فکشن کا ایک اہم جز رہی ہے۔ منظر نگاری کے ذریعے ہی کوئی فن کار قاری کے ذہن میں اپنی تخلیقی کائنات بساتا ہے یعنی وہ منظر نگاری کی مدد سے ہی اپنے قاری کو اپنی تخلیق کا حصّہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کہانی اُس کے ذہن میں فلم کی طرح چلنے لگتی ہے۔ لیکن افسانچہ چوں کہ بے حد مختصر ہوتا ہے کئی بار چند سطروں پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے منظر نگاری ایسے افسانچوں کا حصّہ نہیں بنتی۔ لیکن پانچ دس سطروں یا اس سے زیادہ جملوں کے افسانچوں میں منظر نگاری کا عکس ضرور نظر آتا ہے۔

جزئیات نگاری:

ایک زمانہ تھا جب فکشن تفریح کا سب سے اہم وسیلہ تھا۔ ادب تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ مانا جاتا تھا۔ لوگ طویل تحریریں پڑھنے کے عادی تھے۔ اس دور کا فکشن نگار بھی اپنی تحریروں کو جزئیات نگاری کی مدد سے بڑھاتا رہتا تھا۔ وہ اپنی تحریر کے اصل موضوع کے علاوہ دوسرے غیر ضروری واقعات کو بھی اپنی تخلیق کا حصّہ بناتا رہتا تھا۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی نے اپنی تمام تخلیقات میں اپنے موضوع کے علاوہ پنجابی کلچر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اسی طرح منشی پریم چند نے یوپی کے جاگیردار نظام کو مکمل نقشہ اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ لیکن افسانچہ چوں کہ ایک بھی زائد جملہ تو کیا ایک حرف کا بھی بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے افسانچہ نگاری میں جزئیات نگاری کا استعمال نہیں ہوتا۔ نتیجے کے طور پر فکشن کا ایک بہت اہم جز افسانچہ نگاری سے خارج ہو گیا ہے۔

کردار نگاری:

فکشن کی دوسری اصناف کی مانند کردار نگاری بھی افسانچہ نگاری کا بہت اہم جز ہے۔

لیکن داستان، ناول اور افسانہ نگاری کے برعکس افسانچے میں کرداروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔اکثر افسانچوں میں ایک دو کردار ہوتے ہیں۔

عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت کم افسانچہ نگار اپنے کرداروں کو نام دیتے ہیں۔ وہ کرداروں کے نام کے بجائے اسم ضمیر سے انہیں مخاطب کرتے ہیں۔ مثلاً میں، وہ، اس، ہم اور انھیں وغیرہ۔ افسانچہ نگاری میں کردار نگاری کے متعلق فردوس احمد بٹ کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ''کردار کم سے کم ایک یا دو ہوتے ہیں۔ کرداروں کے نام کی بجائے اکثر ضمیر سے کام لیا جاتا ہے جیسے وہ، ہم، اس اور میں وغیرہ۔''

(ڈاکٹر عظیم راہی بحیثیت افسانچہ نگار۔ص:26)

سعادت حسن منٹو کا ایک افسانچہ ''کرامات'' اس ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے۔اس افسانچے میں منٹو نے اپنے کرداروں کو نام نہیں دیئے۔ بلکہ اسمِ ضمیر کی مدد سے افسانچے کا تانا بانا تیار کیا ہے۔

کرامات

> لوٹا ہوا مال برآمد کرنے کے لیے پولیس نے چھاپے مارنے شروع کیے۔لوگ لوٹا ہوا مال رات کے اندھیرے میں باہر پھینکنے لگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنا مال موقع پا کر اپنے سے علیحدہ کر دیا تا کہ قانونی گرفت سے بچے رہیں۔ ایک آدمی کو بہت دقت پیش آئی۔ اس کے پاس شکر کی دو بوریاں تھیں۔ جو اس نے پنساری کی دکان سے لوٹی تھیں۔ایک تو وہ جوں کی توں رات کے اندھیرے میں پاس والے کنویں میں پھینک آیا۔لیکن

جب دوسری اس میں ڈالنے لگا۔تو خود بھی ساتھ چلا گیا۔شور سن
کر لوگ اکھٹے ہو گئے کنویں میں رسیاں ڈالی گئیں۔ دونو جوان
نیچے اُترے اوراس آدمی کو باہر نکال لیا۔لیکن چند گھنٹوں کے بعد
وہ مر گیا۔ دوسرے دن جب لوگوں نے استعمال کے لیے پانی
نکالا تو وہ میٹھا تھا۔اس رات اس آدمی کی قبر پر دیئے جل رہے تھے۔

اسی طرح رتن سنگھ نے بھی اپنے افسانچوں کے مجموعے''مانک موتی''میں اپنے کرداروں کو نام دینے کی بجائے اسمِ ضمیر کے ذریعے پیش کیا ہے۔جوگیندر پال کے افسانچوں کے مجموعے''نہیں رحمان بابو۔۔۔!'' کے سبھی افسانچوں کا ایک ہی کردار رحمان بابو ہے۔افسانچہ نگار اس مجموعے کے سبھی افسانچوں میں رحمان بابو سے محوِ گفتگو ہے۔ایک افسانچہ ملاحظہ فرمائیں:

میرے کلینک میں آج ایک روبو (روبوٹ) آ نکلا، رحمٰن بابو،
چیک اَپ کے بعد میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ
بتانے لگا، تھکا تھکا سا رہنے لگا ہوں، ڈاکٹر اور اس کی شکایت سُن
کر مجھے یہ فکر لاحق ہونے لگی کہ کہیں اُس میں جان تو نہیں پڑ
گئی۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانچہ نگاری میں زیادہ کرداروں کی بھرمار سے پرہیز کرنا چاہیے۔اس سے قاری کو افسانچہ سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ہی کہانی کا خیال بھی متاثر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ بہت سے افسانچے بیانیہ انداز میں لکھے جاتے ہیں۔جن میں افسانچہ نگار خود ہی کہانی بیان کرتا ہے۔ایسے افسانچوں میں ایک بھی کردار نہیں ہوتا۔''سیاہ حاشیے'' کا بیانیہ انداز میں لکھا ایک افسانچہ ملاحظہ فرمائیں:

دعوتِ عمل

آگ لگی تو سارا محلّہ جل گیا۔ صرف ایک دوکان بچی جس کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا۔ یہاں عمارت سازی کا جملہ سامان ملتا ہے۔

مکالمہ نگاری:

اردو افسانچہ نگاری کے مطالعہ کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں دو طرح کے افسانچے لکھے جاتے ہیں۔ پہلی قسم کے افسانچے بیانیہ افسانچے ہیں۔ جن میں افسانچہ نگار کہانی اپنی زبانی پیش کرتا ہے۔

ایسے افسانچوں میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔ جب کردار نہیں ہوتے تو مکالمے کون ادا کرے گا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیانیہ کی تکنیک میں لکھے گئے افسانچوں میں مکالمے نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر جوگیندر پال کی بیانیہ کی تکنیک میں لکھا ایک افسانچہ ''کہانی'' ملاحظہ فرمائیں:

کہانی

میں نے ندی کا پیچھا کرنا چاہا، مگر کیسے کرتا؟
وہ تو بہ یک وقت اپنے آگے بھی تھی اور پیچھے بھی!
سو میں بھی لاچار سا اسے چپ چاپ دیکھتا رہ گیا۔

(افسانچے ''پرندے''۔ص:17)

دوسری قسم کے افسانچے وہ ہوتے ہیں جن میں زندہ جاوید کردار ہوتے ہیں۔ جو اپنے احساسات، جذبات اور مسائل کو بیان کرنے کے لیے اپنی مادری زبان میں مکالمے ادا کرتے ہیں۔ لیکن فکشن کی دوسری اصناف کے برعکس افسانچہ نگار میں کرداروں کے منہ سے ادا ہونے والے مکالمے مختصر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر محمد

بشیر مالیرکوٹلوی کا ایک افسانچہ ''وارننگ'' پیش خدمت ہے:

وارننگ

''یہ کیا کیا تم نے۔۔!؟۔۔۔۔۔۔داڑھی رکھ لی۔۔۔۔۔!؟''

''ہاں بھئی داڑھی رکھنا۔سنت ہے۔۔۔۔اور ثواب بھی۔۔۔''

''یہ شرعی معاملہ ہے۔ میاں۔ یہاں اگر مگر کی گنجائش نہیں۔۔۔۔''

''لیکن۔۔۔۔۔؟۔۔۔آپ جہاں جاؤ، اپنا آئی کارڈ جیب میں رکھ لینا۔۔۔۔۔''

(افسانہ،افسانچہ تکنیکی تناظر میں۔ص120)

مکالمہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ جو بہت ریاضت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔اصل میں مکالمے لکھنے کے لیے افسانچہ نگار کو اپنے کردار کا بغور مطالعہ کرنا پڑھتا ہے۔تبھی وہ اپنے کردار کی زبان سے حقیقی جملے ادا کرواسکتا ہے۔لیکن افسانچہ نگاری میں کیوں کہ اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔اس لیے افسانچہ نگار کو چاہیے کہ وہ اپنے کرداروں سے چھوٹے جملے ادا کروائے۔افسانچے کے مکالمے چست اور مختصر ہونے چاہئیں۔

نقطۂ عروج:

نقطۂ عروج افسانچہ نگاری کا بے حد اہم جز ہے۔کسی بھی افسانچے کی کامیابی اس کے نقطۂ عروج پر منحصر ہوتی ہے۔افسانچے کا عروج بے حد مؤثر اور جان دار ہونا چاہیے تا کہ قاری کے دل ودماغ پر گہرا ہو یعنی وہ افسانچے کی پیش کاری اور افسانچہ نگار کے خیال سے متاثر ہو۔

اصل میں افسانچہ نگاری میں افسانچہ نگار کو اپنے خیال کو اس انداز سے پیش

کرنا ہوتا ہے کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ مختصر کہانی میں نقطۂ عروج کی اہمیت کو مشہور و معروف قلم کار اظہار اثر کچھ یوں واضح کرتے ہیں:

''مختصر کہانی صرف بات کہنے سے نہیں بنتی بلکہ نقطۂ عروج ایسا ہونا چاہیے کہ تخلیق کار کی بات قاری کے دل میں تیر کی طرح اترتی چلی جائے۔''

(ماہنامہ ''گونج'' حیدرآباد۔ رحیم انور نمبر۔ ستمبر 1996)

افسانچہ احساس، افسانویت اور تاثر جیسے اجزاء کا مرکب ہے۔ یعنی جس افسانچے میں یہ اجزاء پائے جائیں گے وہی افسانچہ کامیاب مانا جائے گا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مجید بیدار رقم طراز ہیں:

''جس طرح بم الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹران سے مل کر بنتا ہے اور ایک بڑے دھماکے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اسی طرح افسانہ احساس افسانویت اور تاثر سے مرکب ہوتا ہے۔ جب مناسب انداز سے مخلوط ہو جانا دھماکہ ثابت ہوتا ہے۔ بم کا دھماکہ زمین یا فضا میں ہوتا ہے چنانچہ افسانہ کا دھماکہ قاری کے ذہن اور سوچ کے ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔''

(اردو میں افسانچہ کی روایت، ص ۶۴)

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقطۂ عروج افسانچے کا وہ حصّہ ہے جو افسانچے کے آغاز اور اختتام کو آپس میں جوڑتا ہے۔ اگر کسی افسانچے کا یہ درمیانی پہلو ڈھیلا ہوگا تو قاری اختتام پر پہنچنے سے ہی پہلے ہی اوب جائے گا۔ اس لیے افسانچہ نگاری میں نقطۂ عروج کی بہت اہمیت ہے۔

اختتام یا انجام یا کلائمکس:

فکشن کی دوسری اصناف کی مانند افسانچے کے آخری جملوں کو اختتام یا

انجام یا کلائمکس کا نام دیا جاتا ہے۔افسانے سپاٹ اور اینٹی کلائمکس بھی لکھے گئے ہیں یا لکھے جا رہے ہیں یعنی ایسے افسانے جن کا انجام افسانہ پڑھتے پڑھتے ہی قاری پر کھل جاتا ہے جس کے نتیجے میں قاری کی افسانے میں دلچسپی کم ہو جاتی ہے جب کہ افسانچے میں کلائمکس کا چونکا دینے والا ہونا بے حد ضروری ہے۔ بلکہ افسانچے کا کلائمکس بم کی طرح پھٹنا چاہیے اور قاری افسانچے کے اختتام پر پوری طرح چونک جائے۔اس کے علاوہ افسانچے کا تانا بانا ایسے بُنا جائے کہ قاری افسانچے کے دوران ہی اختتام پر نہ پہنچ سکے۔افسانچے کے کلائمکس کے متعلق مشہور افسانہ نگار وافسانچہ نگار م۔ناگ لکھتے ہیں:

''منی افسانہ کسی حادثے کا فوری ردعمل ہے اس میں نقطۂ عروج کے بعد سیدھے انجام جگہ پاتا ہے اور انجام چونکا دینے والا، جھٹکا دینے والا اور کچھ سوچنے پر مجبور کرنے والا ہونا چاہیے۔''

(اردو میں افسانچہ کی روایت۔ص:47)

افسانچہ تخلیق کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ تخلیق کار کے بیان سے موضوع کی گرہ نہ کھل جائے۔وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔۔؟ کیوں کہنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔؟ اگر یہ راز قاری پر کھل گیا تو افسانچے کا تجسّس جاتا رہے گا۔تجسّس افسانچے کی خوب صورتی اور کشش میں اضافہ کرتا ہے۔

قاری بڑے انہاک سے مطالعہ میں غرق ہونا چاہیے اور اس کے ذہن میں یہی سوالات افسانچے کے اختتام تک گونجیں کہ اب کیا ہوگا۔۔۔؟ آگے کیا ہوگا۔۔۔؟ آگے کیا ہونے والا ہے۔۔۔!؟ اس کے بعد کیا ہوگا۔۔۔؟ ان سوالات کو ہی ہم تجسّس کا نام دیتے ہیں۔اس کو ہم سسپنس بھی کہہ سکتے ہیں۔اگر ان سوالات کا حل قاری نے اختتام سے پہلے ڈھونڈ لیا تو سمجھو افسانچے میں تجسّس نہیں رہا اور قاری کی دلچسپی کم ہوتی جائے گی۔اس لیے ضروری ہے کہ افسانچے میں اختتام تک تجسّس قائم

رکھنے کی کوشش کی جائے۔ظاہر ہے تجسّس آپ کے اسلوب کی خوب صورتی ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانچہ نقطۂ عروج سے سیدھا انجام کو پہنچتا ہے۔اس لیے افسانچے کا انجام چونکا دینے ولا ہونا چاہیے بلکہ قاری کے ذہن میں افسانچے کا جو اختتام ہو اس کے برعکس ہونا چاہیے۔اس سے قاری کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔مختصر یہ کہ کسی بھی خیال کو کم سے کم الفاظ میں بیان کر دینے کے ساتھ ہی اختتام پر قاری کا چونکنا اور متاثر ہونا لازمی ہے۔ورنہ افسانچہ، افسانچہ نہ ہو کر ایک واقعہ بن جاتا ہے۔

زبان و بیان:

زبان و بیان ایک ایسی اصطلاح ہے۔ جو دو مختلف الفاظ زبان اور بیان کا مرکب ہے۔ یہاں پر زبان سے مراد تخلیق کے الفاظ سے ہے اور بیان سے مراد تخلیق کار کے اسلوب سے ہے یعنی فکشن نگار کے تخلیق کی پیش کاری سے ہے۔

فکشن کی کوئی بھی صنف ہو۔قلم کار کا کہانی کی زبان و بیان پر عبور ہونا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ زبان و بیان کی خوبصورتی ہی کسی تحریر کو دلچسپ اور خوبصورت بناتی ہے۔تخلیق کار کا منفرد اسلوب ہی قاری کو تخلیق کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔

زبان کی شگفتگی، سادگی اور مٹھاس کسی بھی تحریر کو مؤثر اور قابلِ قبول بناتی ہے۔الفاظ کا استعمال سلیقے سے کرنا، بجالفاظی اور بھاری بھرکم الفاظ کے استعمال سے پرہیز اور مشکل محاوروں اور تشبیہات کے استعمال سے بچنا چاہئے۔ کیونکہ یہ سبھی چیزیں کسی بھی تحریر کو بوجھل اور کھردرا بناتیں ہیں۔جس کی وجہ سے مطالعے کے دوران قاری کا تحریر سے بار بار تسلسل ٹوٹتا ہے نتیجے کے طور پر قاری اوب جاتا ہے۔

افسانچے میں الفاظ کا استعمال اور بھی مشکل ہے۔ کیونکہ افسانچہ ایک بھی زائد حرف برداشت نہیں کر سکتا۔افسانچے میں افسانچہ نگار کو الفاظ اس طرح جڑنے

ہوتے ہیں جیسے سونے کے زیور میں موتی۔ اس کے علاوہ افسانچے کی عمارت بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ اس لیے اس صنف میں الفاظ کا استعمال اور بھی احتیاط سے کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں معروف نقاد سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''افسانچے اسی وقت نکھرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں جب افسانچہ نگار لفظوں کی قدر و قیمت، ان کی معنوی تہ داری اور ان کے درون کے اسرار سے واقف ہو اور کفایت لفظی کا ہُنر جانتا ہو کہ کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے پر قادر ہو۔ گویا لفظ کو گنجینِ معنی کا طلسم بنادے۔ زبان کا تخلیقی استعمال ہو تو اور کیا چاہیے۔''

(ماہنامہ ''توازن'' مئی تا دسمبر ۲۰۰۱ء [] ص ۶۳۔۷۳)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک بہترین، منفرد اور کامیاب افسانچہ لکھنے کے لیے تخلیق کار کا زبان و بیان پر عبور بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ افسانچے کی خوبصورتی اس کے زبان و بیان پر ہی منحصر کرتی ہے۔

ضروری ہدایات:

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانچہ نگاری فکشن کی جدید ترین صنف ہے۔ جو اپنے ادبی سفر کی سات دہائیاں پار کر چکی ہے۔ اس طرح افسانچہ نگاری اپنے ابتدائی سفر کی منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ اخبار و رسائل نے بھی اس مختصر صنف کا خیر مقدم کیا ہے۔ اب بیشتر اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں میں افسانچے ہی شائع ہوتے ہیں۔ کثیر تعداد میں افسانچوں کے مجموعے شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن ان افسانچوں کے مجموعوں کے مطالعے کے بعد یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ بہت سے افسانچہ نگار اب بھی لطیفوں، آزاد نظموں، اقوال زریں اور حکایتوں کو افسانچے کا روپ دے رہے ہیں۔ یہاں پر یہ بات واضح رہنا بے حد ضروری ہے کہ

افسانچہ نگاری ایک منفرد صنف ہے۔جس میں مندرجہ ذیل شرائط کا پاس رکھنا لازمی ہے۔

1۔افسانچے میں اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو کم سے کم لفظوں یا جملوں میں بیان کرنا چاہئے۔

2۔افسانچہ کا موضوع منفرد، اچھوتا اور نیا ہونا چاہیے۔ پرانے اور گھسے پٹے موضوعات پر لکھے افسانچے قاری کو متاثر نہیں کرتے۔

3۔افسانچہ میں پلاٹ کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی اس مختصر نثر پارے میں طویل کہانی کا تاثر پوشیدہ ہونا چاہیے۔

4۔طویل منظر نگاری کو افسانچہ برداشت نہیں کرتا۔لہٰذا اگر افسانچہ نگار کو منظر نگاری کی ضرورت محسوس ہو تو اختصار سے کام لیا جائے۔

5۔افسانچے میں کرداروں کی بھرمار نہیں ہوتی۔عموماً افسانچے میں ایک یا دو کردار ہی ہوتے ہیں۔

6۔مکالمہ نگاری بھی افسانچہ نگاری کا اہم جز ہے۔لیکن افسانچے کے کرداروں کے منہ سے ادا ہونے والے مکالمے مختصر، جامع اور چست ہونے چاہئیں۔

7۔نقطۂ عروج افسانچہ نگار کا بہت ہی اہم جز ہے۔نقطۂ عروج جان دار اور شان دار ہونا چاہیے۔

8۔افسانچے کا اختتام چونکا دینے والا اور جھٹکا دینے والا اور سوچنے پر مجبور کرنے والا ہونا چاہیے۔

☆☆☆

☆......ڈاکٹر ریاض توحیدی

افسانچہ نگاری۔۔۔فن اور تکنیک

ادب اور زندگی کے مابین موضوعی ارتباط (Subjective correlation) ہی ادب کو زندگی کا ترجمان بناتا ہے' نہیں تو فنی طور پر ادب میں وہ خیالات اور موضوعات بھی پیش ہوتے ہیں جو زندگی کے ترجمان نہیں بلکہ ادب کے جمالیاتی احساس کی ترجمانی کرتے ہیں، جس طرح شاعری میں جیتی جاگتی زندگی کی منظوم ترجمانی ہوتی ہے اور کبھی کبھی صرف تخیل کی پرواز سے شعر تخلیق ہوتا ہے۔ فکشن ادب کا ایک طاقتور جزو ہے۔ اس میں زیادہ تر معاشی و عائلی' سیاسی و سماجی اور نجی و نفسیاتی موضوعات و مسائل کو فکشنائز کر کے کہانی کا روپ دیا جاتا ہے۔ فکشن کی سماجی نمائندگی کے ضمن میں گیلین کراس نے خوبصورت بات کہی ہے کہ

''یہ سماجی موضوعات کو دریافت یا اجاگر کرنے کا ایک طاقتور وسیلہ ہے۔''

فکشن میں ناول کے بعد افسانہ ایک ایسی صنف ہے جو نثر میں مقبول ہے۔ اب تو بدلتے مزاج کے ساتھ ساتھ افسانے کی کئی اور ذیلی صورتیں بھی اپنی مقبولیت کا ڈنکا بجا رہی ہیں۔ جیسے:

fantasy fiction, Science fiction,Suspense Flash fiction, Horror fiction, Historical fiction Mystery fiction, Psycho fiction, Detective fiction, Mythical fiction, Ethical Micro Fiction, Nano

fiction, Moral fiction, Commedy fiction,Visionary fiction,Crime fiction,Thriller fiction,Resistance fiction, Adventurefiction.......etc

فنی اور موضوعاتی سطح پر ان سبھی کی اپنی اہمیت اور اسلوب ہے۔یعنی کون سا فکشن کس طرح کسی خاص زمرے میں آ سکتا ہے۔ان ہی وجوہات کی بنا پر اب اردو افسانہ ایک شجر سایہ دار بن چکا ہے اور یہ ہیتی،تکنیکی اور موضوعاتی سطح پر ارتقا کی جانب رواں دواں ہے۔دراصل فکشن یا افسانے کی کوئی بھی صنف ہو'تو اس میں پہلی خوبی یہ نظر آنی چاہئے کہ وہ فکشن نظر آئے'یہی خوبی اس کو فکشن کے دائرے میں لاتی ہے۔اس کے لئے مشاہدے کی پیشکش میں تخیل کی آمیزش لازمی ہوتی ہے،نہیں تو یہ ایک سنی سنائی بات'لطیفہ یا مانوس واقعہ بن جائے گا۔اس ضمن میں مائیکل اسکارٹ کی بات بڑی اہم ہے کہ تخیل،علم سے زیادہ اہم ہوتا ہے:

"Imagination is more important than knowledge."

ویسے کسی بھی تخلیق 'شعر وفکشن' میں تخیل ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب افسانچے کی بات کریں تو افسانچہ ایک طرح سے افسانے کا چھوٹا روپ ہوتا ہے اور افسانہ یا افسانچہ کی ایک اہم شرط افسانویت(Fictionality) کا ہونا ہے'پھر اسلوب چاہے آسان ہو یا علامتی لیکن دونوں جگہ تخلیقی رچاؤ نظر آنا چاہئے۔اس ضمن میں معروف افسانچہ نگار ڈاکٹر ایم۔اے۔حق نے اپنے ایک مضمون''افسانچہ کیا ہے؟''میں تمثیلی انداز سے فن افسانچہ پر گفتگو کرتے ہوئے خوبصورت بات کہی ہے کہ:

''افسانچہ'دراصل افسانے کی بونسائی(Bonsai)شکل ہے۔

جس طرح بونسائی کا بنانا آسان کام نہیں ہے ٹھیک اسی طرح ہر قلم کار کے لئے افسانچے تحریر کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لئے فنی مہارت، ذہانت، محنت، لگن، افسانچے کی تکنیک سے واقفیت، الفاظ پر کنٹرول ہونا لازمی ہے۔اس لئے افسانے کے اجزائے ترکیبی جیسے پلاٹ، کردار، مکالمے، کلائمکس، پیغام وغیرہ کو نہایت فنی چابک دستی سے افسانچے کی شکل میں ترتیب دی جاتی ہے۔''

بونسائی تکنیک کی بات کسی اور مناسب جگہ.... تاہم ایم۔اے۔حق نے اس تکنیک کی تمثیل میں فن افسانچہ نگاری کو اچھی طرح سمجھایا ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری افسانچہ کی خوبی سے متعلق لکھتے ہیں کہ

''اختصار، جامعیت، طنز اور قصہ پن افسانچے کی خوبی ہے۔''

بنیادی طور پر فنی مہارت، ذہانت، تکنیک، الفاظ پر کنٹرول، پلاٹ، مکالمہ، کردار، اختصار، کلائمکس جیسے اہم فنی اور تکنیکی عناصر ایک افسانچے کی خوبیاں ہیں۔اگر چہ ان اجزا کا اطلاق افسانچے میں ہنرمندی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ طویل افسانے کا پلاٹ وسیع ہوتا ہے اور افسانچہ محدود پلاٹ کا حامل۔اس سب کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جب بیشتر افسانچے اخبارات، سوشل میڈیا، یہاں تک کہ کتابوں میں ایسے نظر آتے ہیں جن میں دو تین جملوں میں صرف ایک خیال یا تصور پیش کیا گیا ہوتا ہے اور کئی لوگ فنی عناصر پر غور کئے بغیر صرف خیال کی تشریح کرنا شروع کر دیتے ہیں۔افسانچہ لکھنا بنیادی طور پر افسانہ لکھنے کی طرح ماہرانہ ہنرمندی (Artistic skilfullness) کا تقاضا کرتا ہے۔

جیسے: منٹو کا ایک افسانچہ ''کرامات'' دیکھیں کہ کس طرح اس میں کہانی

پن بھی ہے اور کردار نگاری بھی اور توہم پرستی پر طنز ملیح بھی ہے:

''لوٹا ہوا مال برآمد کرنے کے لئے پولیس نے چھاپے مارنے شروع کئے۔۔۔ لوگ ڈر کے مارے لوٹا ہوا مال رات کے اندھیرے میں باہر پھینکنے لگے، کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنا مال بھی موقع پا کر اپنے سے علاحدہ کر دیا تا کہ قانونی گرفت سے بچے رہیں۔۔۔ ایک آدمی کو بہت دقت پیش آئی۔۔۔ اس کے پاس شکر کی دو بوریاں تھیں جو اس نے پنساری کی دکان سے لوٹی تھیں۔۔۔ ایک تو وہ جوں کی توں رات کے اندھیرے میں پاس والے کنوئیں میں پھینک آیا لیکن جب دوسری اٹھا کر اس میں ڈالنے لگا تو خود بھی ساتھ چلا گیا۔۔۔ شور سن کر لوگ اکھٹے ہو گئے۔۔۔ کنوئیں میں رسیاں ڈالی گئیں۔۔۔ دو جوان نیچے اترے اور اس آدمی کو باہر نکال لیا۔۔۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد وہ مر گیا۔۔۔ دوسرے دن جب لوگوں نے استعمال کے لئے اس کنوئیں میں سے پانی نکالا تو وہ میٹھا تھا۔۔۔ اسی رات اس آدمی کی قبر پر دیئے جل رہے تھے۔''

افسانچہ تخلیق کرنے کے دوران بیشتر لکھنے والے زبان و بیان کا خیال رکھتے نظر نہیں آتے ہیں۔ ایک بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جب جملوں کی درست ساخت کا پتہ نہ ہو تو وہ تحریر یا تخلیق غیر معیاری بن جاتی ہے۔ اگر شعر میں صحیح لفظ یا املا کا خیال نہیں رکھا جائے تو پھر وہ شعر کس کام کا رہے گا شاعر صرف چلاتا رہے کہ اس کے یہ معنی ہیں۔ اسی طرح تخلیق میں بھی صرف تصور سے کام نہیں چلتا ہے بلکہ تخیل اور تخلیقی اسلوب ہی کام آتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ بیشتر لوگ منٹو یا جوگندر پال کے چند افسانچوں کو پڑھ کر افسانچہ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ ان لوگوں کے کچھ افسانچے عمدہ فنکاری کے حامل ہیں تاہم سبھی نہیں۔ کیونکہ فنی طور پر ان کو مزاحیہ شہ پارے کہا گیا ہے۔ اگر منٹو سے زندگی نے وفا کی ہوتی تو امید تھی کہ وہ فن افسانچہ نگاری کو ایک معیاری سمت دے دیتے۔ اس لئے بغیر کوئی دھوکہ کھائے چند سطور میں صرف تصور کو پیش کرنا افسانچہ نگاری نہیں، یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ ایک اور مسئلہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بیشتر افسانچہ نگار بیان (Narration) اور بیانیہ (Narrative) کے مابین فرق سمجھنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان افسانچوں میں صرف بیان ہی بیان نظر آتا ہے۔ جبکہ افسانہ یا افسانچے کا بیشتر پلاٹ بیانیہ نوعیت کا ہونا چاہئے اور پنچ لائن میں افسانچہ نگار کی ہنرمندی کا کمال نظر آنا چاہئے۔ جیسے جوگیندر پال کا افسانچہ ''غریب کی دنیا''

''سات آنے کا ٹکٹ دینا، بھیا''

سات آنے کے سارے ٹکٹ ختم ہو چکے ہیں۔ اب صرف ایک روپیہ دو آنے والے باقی ہیں۔''

''کسی طرح ایک ٹکٹ کا انتظام کر دو، میرے پاس صرف سات آنے ہی ہیں۔''

''اگر فلم دیکھنی ہے تو ایک روپیہ دو آنے نکالو!''

''کہاں سے نکالوں؟ دے دو نا سات آنے کا ہی!''

''ارے بھائی! کیوں میرا وقت ضائع کر رہے ہو؟ یہ کوئی معمولی فلم نہیں ہے ،غریب کی دنیا ہے سمجھے؟''

''ہاں سمجھا' سالی غریب کی دنیا تو ہے ہی امیر کی تفریح کے لئے۔''

افسانچے میں تجسس بھی ہونا چاہئے اور خصوصاً کلائمکس زوردار ہونا چاہئے۔ حسب ضرورت مکالمے بھی ہوں اور وحدت تاثر بھی۔ یعنی تھیم Single point

effect کا تاثر چھوڑے۔۔۔۔افسانچہ کم از کم ایک مختصر ترین کہانی سامنے لائے۔ یعنی اس پر ایک Short film بنائی جا سکے۔۔۔کردار نگاری بھی اہم ہے۔اس تعلق سے معروف افسانچہ نگار ڈاکٹر عظیم راہی اور رونق جمال کے یہ خیالات ملاحظہ فرمائیں:

''افسانچہ ایک مکمل کہانی پن کے ساتھ قاری کو جھنجوڑنے والی کیفیت چاہتا ہے۔اختصار اس کی پہچان ہے۔موضوع کا اچھوتا پن اور ڈرامائی صورت حال اختتام پر پڑھنے والے کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔'' (ڈاکٹر عظیم راہی)

''افسانچے میں یہ کمال ہے کہ چند سطروں میں ایک مسئلے پر قلم کار بہت بڑی بہت گہری اور نہایت تیزی سے چوٹ کر کے دھما کہ کر دیتا ہے۔'' (رونق جمال)

زیادہ تر افسانچوں میں راوی یا افسانچہ نگار ایک واقعہ بیان کرتا نظر آتا ہے اور کہیں کہیں پر دل کی بھڑاس نکالتا دکھائی دیتا ہے۔افسانچہ لکھنا فن کاری ہے نہ کہ تقریر کے لئے چند جملے لکھنا۔افسانہ اگر پیڑ ہے تو افسانچہ پودا۔بس پودے کی ایک شاخ دکھا کر پورا پودا دکھانے کی کوشش نہیں دکھانی چاہئے۔

آج کل کے بیشتر افسانچے نینو فکشن کی ذیل میں آتے ہیں۔دوسری ذیلی اصناف کو چھوڑ کر نینو فکشن میں ان سب چیزوں کا التزام ضروری نہیں بس خیال کو چند الفاظ یا جملوں میں ایک تصور کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور سننے یا پڑھنے والے کے ذہن میں بھی اس سے متعلق ایک خیال ابھرتا ہے۔یعنی لکھنے والا اپنا پیغام مختصر ترین انداز سے چھوڑ جاتا ہے۔اس کے لئے زیادہ محنت بھی نہیں کرنا پڑتی ہے۔بس کسی بھی خیال کو چند سطور میں پیش کیا جاسکتا ہے۔اس لئے افسانچہ لکھنا فنی مہارت 'وسیع

المطالعہ 'ذہنی ریاضت کا تقاضا کرتا ہے۔افسانچے کو اگر افسانے کا بچہ تصور کیا جائے تو ایک بڑے انسان کی طرح بچے میں بڑے انسان جیسا ڈھانچہ تو ہونا چاہئے ،البتہ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا قد ابھی کتنا ہے لیکن آنکھ ،ناک ،ہاتھ، پیر وغیرہ کا ہونا تو ضروری ہے۔یا ہم کسی کو بچے کی ناک یا آنکھ یا بازو دکھا کر کہیں کہ یہ ہے بچہ...؟ جیسا کہ بشیر مالیر کوٹلوی صاحب کی مناسب رائے:

''جس طرح کتاب سے کتابچہ'صندوق سے صندوقچہ' اسی طرح افسانے سے افسانچہ۔''

اس مختصر اقتباس سے ظاہر ہے کہ اگر صندوق سے صندوقچہ کے تصور پر غور کریں تو صندوقچہ وہی ہوتا ہے جو بڑے صندوقچے کا چھوٹا روپ ہو نہ کہ کوئی انسان صندوقچے کی لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہاتھ میں اٹھائے دکھاتا پھرے کہ یہ ہے صندوقچہ...!

اسی طرح جہاں تک افسانچے کی ساخت یا اسلوب کا تعلق ہے تو اس میں بھی بڑے افسانے کی چھوٹی ہئیت تو ہونی چاہئے اور افسانوی اسلوب بھی نظر آئے پھر چاہے آنکھ یا ناک پر ہی کیوں نہ فوکس کیا گیا ہو اور ایک مختصر کہانی سامنے آتی ہو۔اس لئے یک سطری، دوسطری تصورات افسانچے کے زمرے میں نہیں آسکتے ہیں۔البتہ اگر افسانوی ہیئت میں ایک کہانی دس پندرہ سطور پر بھی مشتمل ہو اور ایک بھر پور کہانی کا تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہے تو وہ افسانچے کے زمرے میں آئے گی۔افسانچہ چند جملوں اور ایک سے ڈیڑھ صفحے پر بھی مشتمل ہوسکتا ہے لیکن افسانچہ ہونا چاہئے۔ایک اور بات یہ کہ افسانچہ صرف طنز نگاری کا نام نہیں ہے۔ہاں کبھی کبھی طنز کا پہلو بھی اس میں شامل ہوسکتا ہے۔البتہ افسانچے میں موضوعاتی طور پر کم سے کم خیالات میں حیرت انگیز تاثر ضرور ہونا چاہئے یعنی قاری کو کچھ نہ کچھ سوچنے پر مائل کرے' نہ کہ ختم کرنے پر لطیفہ معلوم ہو جائے۔اسلوب کی سطح پر اگر افسانچہ علامتی اسلوب کا حامل ہو یا اس میں

ابہامی کیفیت بھی ہوتو بھی کام چلے گا لیکن اس میں سوچنے کے لئے کچھ نہ کچھ رکھا گیا ہو۔

افسانچہ افسانے کی ذیلی صنف ہے تو اس کی تخلیق بھی ایسی ہونی چاہئے کہ قاری کو ایسا محسوس ہو جائے کہ وہ کوئی افسانچہ/فکشن پڑھ رہا ہے نہ کہ کسی اخبار کی سرخی یا کوئی لطیفہ۔ جس طرح شاعری کے اقسام میں نظم 'غزل' قصیدہ' رباعی' قطعہ وغیرہ ہیں لیکن فنی طور پر رباعی کے نام پر پیش ہوئے کلام کو اسی وقت رباعی کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے جب وہ فنی طور پر رباعی کے چار مصرعوں پر مشتمل ہو۔ یہ نہیں کہ کوئی ایک مصرع لکھ کر اسے رباعی کہنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگائے۔ اسی طرح ایک جملہ تحریر تو خیال کی پیش کش ہوسکتی ہے لیکن افسانچہ نہیں۔ اب موضوع کو سمیٹتے ہوئے اپنا افسانچہ ''مزدور کے خواب'' پیش کر کے گفتگو ختم کریں گے :

''چل جلدی گاڑی صاف کر، آج ایک اہم پروگرام کی صدارت کرنی ہے''۔ شہر کے نامی گرامی سرکاری افسر نے ناشتہ کرنے کے بعد راموسے کہا۔

راموکئی برسوں سے سرکاری افسر کے ہاں کام کر رہا تھا۔ اس نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گاڑی کو دھو کر چمکایا۔ افسر چمکتی گاڑی دیکھتے ہوئے خوش ہو کر بولا:

''آج ہمارے ساتھ تو بھی پروگرام میں چلے گا، کیونکہ مالکن بھی میرے ساتھ پروگرام میں جا رہی ہے اور یہ مزدوروں کا ہی تو دن ہے۔ وہاں پر تم کو میرے ساتھ دیکھ کر لوگ بھی میری مزدور دوستی سے خوش ہو جائیں گے''۔

راموبھی یہ سن کر خوش ہوا کہ آج صاحب کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آرہے ہیں تو خوشی کے مارے وہ ہاتھ جوڑے التجا کرنے لگا:

"جی مالک۔۔۔ پھر آج میرا کام ہو جائے گا۔"

''کون سا کام۔۔۔؟ اچھا یاد آیا۔۔۔ بچی کی شادی کا''کس تاریخ کو ہے''۔

''مالک۔... بس تھوڑے بہت پیسوں کا انتظام ہو جائے ، پھر تاریخ

بھی۔۔۔''

''کتنی بار کہا تم سے کہا کہ میں کپڑے کا ایک جوڑا لا کے دوں گا لیکن تم لوگ بھی شاہی شادی کرنا چاہتے ہو''۔

''مالک۔۔صرف بیس ہزار میں کام ہو جائے گا''۔

''کیوں پروگرام میں جاتے وقت موڑ خراب کر رہے ہو۔صرف بیس ہزار سے کام چلے گا۔ادھر کیا پیسوں کی مشین لگی ہے۔بڑے بڑے خواب دیکھنا بند کرو۔"

تقریب میں افسر کا پُر تپاک استقبال کیا گیا۔تقریر کے دوران اس نے پُر جوش آواز میں کہا:

''مزدوروں کے خواب پورے کرنا ہمارا مشن ہونا چاہئے تا کہ وہ لوگ اگر کچھ زیادہ نہیں کم سے کم زندگی تو آرام سے گزار سکیں۔یہی یوم مزدور منانے کا پیغام ہے۔میں اپنے گھر کے نوکر رامو کو بھی ساتھ لایا ہوں کیونکہ یہ اصل میں انہیں لوگوں کا دن ہے''۔

شامیانہ تالیوں سے گونج اٹھا۔تقریر ختم کرنے کے بعد افسر کی طرف سے مزدور یونین کو بطور فنڈ پچاس ہزار روپے کا چیک پیش ہوا۔تقریب کے اختتام پر جب افسر کو غریبوں کا مسیحا کے ایوارڈ سے نوازا گیا تو رامو بھی آبدیدہ ہو کر تالیوں کی جذباتی گڑگڑاہٹ کا حصہ بن گیا۔

☆☆☆

☆۔۔۔۔۔ڈاکٹر فیض قاضی آبادی

جموں کشمیر میں اُردو افسانچہ

ادب زندگی کا آئینہ ہے اور زندگی مسلسل تغیر پذیر ہے، اس لئے ادب کو بھی ہر لحاظ سے بدلنا پڑتا ہے۔ روسی انقلاب کے بعد مزدور، کمزور اور معاشی لحاظ سے پسماندہ طبقہ جات کی حالت زار دیکھ کر ہی عالمی سطح کے ادب کے ساتھ اردو ادب میں بھی تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ 1936ء کی ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرس میں پریم چند کا کہا ہوا یہ جملہ کہ ''ہمیں ادب کا معیار بدلنا ہوگا'' اردو ادب کی تاریخ میں تاریخی جملہ تصور کیا جاتا ہے۔

ایک وقت وہ تھا جب لوگوں کو فرصت کے لمحات میسر تھے۔ قصے اور کہانیوں کو سننے اور سنانے میں یک گونہ سرشاری فراہم ہوتی تھی تھا۔ مافوق الفطری عناصر یعنی جن، دیو، پری وغیرہ میں گم ہو کر جیسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔ پھر وقت نے کروٹ بدلی تو داستان کی کمی ناول نے پوری کر لی۔ ناول نے حقیقی زندگی کے نشیب و فراز اور بے شمار مسائل کو بڑے خوب صورت پیرائے میں پیش کیا۔ وقت کی چڑیا نے ایک اور اڑان بھر لی اور افسانہ کی صورت میں ایک ایسی صنف دے دی، جس نے ہر ادیب اور ناقد کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ چونکہ افسانہ زندگی کے کسی ایک مگر بہت ہی اہم پہلو کو سمیٹتے ہوئے قاری کو کم وقت میں وہ فکر و بصیرت عطا کرتا ہے جو دوسری فکشن اصناف سے میسر نہیں ہوتا۔ شاید اسی لئے ایک صدی گزرنے کے بعد بھی افسانہ شباب میں ہی نظر آ رہا ہے۔ البتہ بیسویں صدی کے دوسرے نصف سے افسانہ کے

پہلو سے ہی ایک ایسی صنف وجود میں آئی جسے جوگندر پال نے ''افسانچہ'' نام دیا ہے۔

افسانچہ کی باضابطہ بنیاد سعادت حسن منٹو نے ڈالی ہے۔''سیاہ حاشیے'' کے عنوان سے اکتیس افسانچوں پر مشتمل مجموعہ اردو کا پہلا افسانچوں کا مجموعہ کہلاتا ہے جو 1948ء میں شائع ہوا۔منٹو کے لگائے ہوئے اس شجر کو رتن سنگھ نے پانی دیا اور جوگندر پال نے دیکھ ریکھ کی۔اب یہ پودا تناور درخت کی شکل میں ہر گزرنے والے کو سایہ فراہم کر رہا ہے۔بشیر مالیرکوٹلوی،سالک جمیل براڑ،عظیم راہی،رونق جمال،عبدالعزیز خان،ساحر کلیم،ارشد منیم،ایم۔اے۔حق،نخشب مسعود،نذیر مشتاق،نورشاہ،زنفر کھوکھر، دیپک بدکی،حسن ساہو،عارف خورشید، قاضی مشتاق، اکبر عابد، ایم۔ انوار انجم، محمد رفیع مجاہد،اسلم جمشید پوری، ریاض توحیدی، خالد بشیر تلگامی اور راجہ یوسف کے ساتھ ساتھ سینکڑوں افسانچہ نگار اس سایہ سے مستفید ہوکر افسانچہ کی تاریخ کا اہم حصہ بن رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں شمالی پنجاب اور مہاراشٹر کے بعد جموں وکشمیر نے اس صنف کے خدوخال متعین کرنے اور اسے ہر دلعزیز صنف بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے کہ جموں وکشمیر کا پہلا اردو افسانچہ نگار کون ہے۔البتہ عمر مجید،نورشاہ اور وحشی سعید نے افسانہ نگاری کے ساتھ بہترین افسانچے بھی تخلیق کئے ہیں۔

عمر مجید،نورشاہ اور وحشی سعید جموں وکشمیر میں اردو افسانچہ نگاری کا ایک اہم مثلث ہے۔ان تینوں نے ادبی زندگی کا آغاز تقریباً ایک ہی دور میں کیا ہے۔عمر مجید اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔ان کی پہلی کہانی 1965ء میں روزنامہ ''آفتاب'' میں شائع ہوئی تھی اور ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''اجالوں کے گھاؤ'' 1988ء میں شائع ہوا ہے۔معروف قلم کار سلیم سالک نے ''عمر مجید کے بہترین افسانے'' عنوان سے

ایک کتاب ترتیب دی ہے،جس میں انہوں نے عمر مجید کے چوبیس افسانے اور آٹھ افسانچے شامل کئے ہیں۔اردو کے مشہور ناقد اور محقق عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں ان کے افسانوں کے متعلق کہا ہے:۔

> ''عمر مجید کو افسانے لکھنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ ان کی نظر اپنے اطراف کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ان مشاہدات کو وہ سلیقہ سے بیان کرنے کے اسلوب پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ نیچے کے طبقے کے لوگوں، کسانوں اور مزدوروں کی قابل رشک زندگی ان کا عام موضوع ہے''۔

عمر مجید نے بہت کم افسانچے لکھے ہیں۔ دراصل جب انہوں نے ادبی زندگی کا آغاز کیا تو اس وقت افسانچہ ہر طرف سے تنقید کا شکار ہو رہا تھا،اس لئے افسانہ نگار صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے افسانچے لکھتے تھے۔ یہ وقت جموں کشمیر میں اردو افسانے کا دوسرا دور تھا جبکہ اردو افسانچے کا یہ پہلا دور تھا۔اس دور کے افسانہ نگاروں یعنی حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ،نور شاہ، ویدراہی، برج پریمی،مخمور بدخشی، جگدیش بھارتی، تیج بہادر بھان وغیرہ میں صرف چند ایک نے افسانچہ نگاری کی طرف توجہ دی۔منٹو کے آخری نقش قدم پر چلنے والے کچھ جیالے اس دور کے معروف رسائل میں افسانچے لکھتے تھے۔ممکن ہے کہ اُن افسانچہ نگاروں سے متاثر ہو کر عمر مجید نے بھی افسانچے لکھنے شروع کئے ہوں۔ یوم شہدا،قومی شاہراہ، رفتار وغیرہ عمر مجید کے بہترین افسانچے ہیں۔

نور شاہ جموں کشمیر کے معتبر اور معروف فکشن رائٹر ہیں۔پچھلے سٹھ سال سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ان کے دو درجن سے زیادہ افسانوی ادب کے مجموعے شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔جموں کشمیر کے اولین افسانہ نگاروں میں ان کا شمار

ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں اور افسانچوں کا غالب موضوع کشمیر کہانی ہے۔ نور شاہ صرف ایک تکنیک میں نہیں لکھتے، بلکہ تکنیک بدل بدل کر لکھتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں فکشن پر عبور حاصل ہوگیا ہے۔ نور شاہ نے دوسو سے زائد افسانچے تحریر کئے ہیں۔ ان کے افسانچے ملک کے مؤقر ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کشمیر کہانی کے بعد جنس اور رومان ان کی فکشن کے دوسرے غالب موضوع ہین۔ نور شاہ کے قلم میں جادو ہے۔ وہ قاری بھی جسے ان موضوعات میں دلچسپی نہیں ہے، نور شاہ کے افسانے اور افسانچے پڑھ کر ضرور متاثر ہوتا ہے۔ بغیر عنوان کے افسانچے لکھنے کا ٹرینڈ بھی چلا ہے اور اس ٹرینڈ کے شکار نور شاہ بھی ہوئے ہیں۔

وحشی سعید اردو فکشن میں ایک ایسا نام ہے جسے بہت دیر تک یاد رکھا جائے گا۔ سولہ سال کی عمر میں ناول لکھا اور بیس سال کی عمر سے ماہنامہ شاعر اور دیگر کئی موقر رسائل وجرائد میں چھپتے رہے ہیں۔ ان کے ایک درجن ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہوکر ادب شناسوں اور ناقدین سے داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ اس میں پندرہ مختصر افسانے اور چھ افسانچے شامل ہیں۔ اس افسانوی مجموعے پر معروف نقاد اور ادیب حامدی کاشمیری اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں:۔

> ''یہ مجموعہ ان کے پہلے مجموعہ سے بالکل الگ نوعیت کا ہے، یہ غیر روایتی افسانوی تکنیک، ہیئت کاری اور لفظ شناسی، فنی برتاؤ، کردار نگاری، معنی آفرینی اور جدت طرازی کی تابندہ مثال ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے افسانے (وافسانچے) جو تخلیقیت کے اسرار اور رموز سے قاری کو حقیقت سے آگاہ کر کے فن کی طلسمی دنیا میں لے جاتے ہیں، ظاہری طور پر یہ مقصدیت یا خارجی

حقیقت سے منحرف نظر آتے ہیں، لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ
(افسانچے و) افسانے اپنے خالق کے نظریاتی موقف، سماجی
نشیب وفراز، حسن وعشق، جنس ورومان، سیاسی چنگیزیت، فرد کی
گمشدگی، خوابوں کی شکست، محرومی اور آزردگی کے رمز وایماء
کے امین ہیں''۔

(وحشی سعید ایک منفرد فکشن نگار از سیفی سرونجی ص ۰۲)

جموں وکشمیر کی خواتین افسانچہ نگاروں میں زینب فردوس کو اوّلیت حاصل ہے۔ان کے افسانچوں کا پہلا مجموعہ " گہرائی" شائع ہو چکا ہے۔اس کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں جی، این پبلی کیشنز، چرار شریف بڈگام سے شائع ہوا ہے۔زینت فردوس شاعری بھی کرتی تھیں۔ان کے اکثر افسانچے نثری نظم کی ذیل میں آتے ہیں۔

جموں وکشمیر میں اردو افسانچہ نگاری کی جب تاریخ مرتب کی جائے گی تو ڈاکٹر نذیر مشتاق کا نام ضرور لیا جائے گا۔نذیر مشتاق پیشہ کے لحاظ سے معالج ہیں۔بیماروں کا علاج کرنا ان کا اصل کام ہے اور اردو زبان وادب کے گیسو سنوارنا ان کا شوق۔شوق ان پر اتنا حاوی ہو گیا ہے کہ موصوف اردو دنیا میں بطور معالج کم جانے جاتے ہیں جبکہ بطور فکشن رائٹر نذیر مشتاق کے نام سے زیادہ مشہور ومعروف ہیں۔''تنکے'' ان کا پہلا افسانچوں کا مجموعہ ہے جو 2020ء میں شائع ہوا ہے۔نذیر مشتاق بہ حیثیت افسانچہ نگار اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔اردو رسائل وجرائد کے ساتھ ساتھ اخبارات کے ادبی اڈیشنز میں ان کے افسانچے شائع ہو کر قارئین سے داد وصول کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر نذیر مشتاق اپنے بیشتر افسانچوں کا تار و پود اپنے کلنک پر ہی بُنتے ہیں۔یہ مریض کو شفایاب کرنے کے سلسلے کے دوران اس میں افسانچہ ڈھونڈنے میں ضرور

کامیاب ہوجاتے ہیں۔وحشی سعید لکھتے ہیں:۔

''نذیر مشتاق کو ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے کہانیوں اور کرداروں کی تلاش میں نکلنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ یہ کردار خود اُن سے ملنے آتے ہیں۔ اپنے دکھ سکھ کی باتیں یاد کرتے ہیں اور اپنی کہانیاں سناتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے اکثر افسانچے اُن کے پیشے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔''

(تنکے۔ادبی کاری گری-وحشی سعید ص ۱۸۵)

تنکے کے پیش لفظ میں نور شاہ نے بھی یہ بات یوں لکھی ہے:۔

''ان کے افسانچوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے گھر کی بالکونی یا لان میں بیٹھ کر افسانچے نہیں لکھتے بلکہ بالکونی اور لان سے باہر آ کر اپنے کرداروں کو زندگی کی کڑی دھوپ میں تلاش کرتے ہیں۔ یہ کڑی دھوپ ان کو اکثر اپنے کلنک میں بھی نظر آتی ہے''۔

(تنکے۔ص ۲۱)

نذیر مشتاق کے افسانچوں کو خوب سراہا جا رہا ہے۔ حالانکہ ان کے بعض افسانچے فنی اور تکنیکی سطح پر کمزور ہیں، لیکن بڑی بات تو یہ ہے کہ انہیں اس بات کا اعتراف بھی ہے۔حکیمانہ انداز میں لکھتے ہیں:۔

''یہ افسانچے میرے بچے ہیں۔ میں ان کی ماں ہوں۔ایک ماں کے بطن سے جنم لینے والے بچے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ان بچوں میں کوئی کمزور تو کوئی توانا ہوگا، کوئی خوب صورت تو کوئی بدصورت ہوگا، کوئی چالاک تو کوئی ناسمجھ ہوگا۔۔۔۔آپ اپنی

سوچ کے مطابق فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس افسانچے میں کیا کمی ہے
یا کیا خوبی ہے''۔

(تنکے ص ۱۷)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے بیشتر افسانچے فنی اور تکنیکی لحاظ سے عمدہ افسانچے ہیں۔ مثلاً افسانچہ ''دیانت'' میں بڑی مہارت سے دیانتداری کا پیغام دیا گیا ہے۔ وہ غریب شخص جو محکمہ فوڈ اینڈ سپلائز میں ملازم ہے اور چاول کے گوداموں کی چابیاں اس کی جیب میں رہتی ہیں۔ ایک رات جب ان کے گھر میں چاول ختم ہو جاتا ہے اور بیوی انہیں کچھ انتظام کرنے کے لئے کہتی ہے، تو اس کا ریسپانس کیا ہوتا ہے وہ اس افسانچہ کے ان دو جملوں سے معلوم ہو جاتا ہے:۔

''اس نے قمیض کی دائیں جانب جیب میں ہاتھ ڈالا اور چابی کو زور سے مٹھی میں بھینچ لیا پھر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتے ہوئے بیوی سے کہا:۔

'' آج کی رات کسی طرح گزار لو، کل مجھے تنخواہ ملے گی تو میں چاول خرید کے لے آؤں گا''۔

حال میں ہی ڈاکٹر نذیر مشتاق کا افسانچوں کا دوسرا مجموعہ ''سوچ'' منظر عام پر آیا ہے۔ امید ہے قارئین دوسری کتاب کا بھی خیر مقدم کریں گے۔

دیپک بدکی فکشن دنیا میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ ان کے چھ افسانوی اور پانچ تنقیدی و تبصراتی مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ہیں۔ انہوں نے افسانچہ کی طرف خاص توجہ دی۔ انہوں نے 2015ء میں افسانچوں کا پہلا مجموعہ ''مٹھی بھر ریت'' شائع کیا ہے۔ جموں کشمیر میں اردو افسانچہ کی ابتدا اگر چہ بہت پہلے ہوئی ہے لیکن مردوں میں افسانچوں کا پہلا مجموعہ شائع کرنے کا سہرا دیپک بدکی کے سر بندھتا

ہے۔اس مجموعہ میں کل ایک سو چار افسانچے شامل ہیں ،جن میں اکثر افسانچے اردو کے موٴقر اور معروف رسائل خاص طور پر ماہنامہ شاعرممبئی، ماہنامہ انشاء، ماہنامہ ایوانِ اردو، ماہنامہ انتساب، ماہنامہ تریاق، دربھنگہ ٹائمز وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔فن اور تکنیک کے لحاظ سے ان کے بیشتر افسانچے(Random Thoughts) کی ذیل میں آتے ہیں۔ان کے افسانچوں میں نہ پنچ لائن ہوتی ہے اور نہ ہی یہ چونکا دیتے ہیں، جبکہ فکشن ناقدین کے نزدیک افسانچہ کے لئے یہ لازم ہیں۔انہیں خود بھی اس بات کا احساس تھا۔چنانچہ لکھتے ہیں:۔

> ''میں نے کچھ افسانچوں میں چند افسانوی عناصر کو عمداً نظر انداز کیا ہے۔کیونکہ میں کسی فارم کا قیدی بننا پسند نہیں کرتا۔ان نثر پاروں میں افسانچوں کی مبادیات کے بدلے فکر و خیال کو ترجیح دی گئی ہے''۔

(مٹھی بھر ریت۔ص۰۲)

جموں کشمیر میں اردو فکشن کی زلف سنوارنے والوں میں ایک نام حسن ساہو کا ہے۔ ان کی ادبی و افسانوی زندگی تقریباً چھ دہائیوں پر مشتمل ہے۔ ان کے چار افسانوں کے مجموعے پھول کا ماتم ،بستی بستی صحرا صحرا، اندھا کنواں اور گردشِ دوراں شائع ہو کر قارئین و ناقدین ادب سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں''۔گردشِ دوراں 2009ء میں شائع ہوا ہے۔اس میں پچیس افسانے اور چھتیس افسانچے شامل ہیں۔ ان کے افسانچوں میں تفریح کم اور طنز زیادہ ہے۔اصلاح معاشرہ اور احترامِ انسانیت پر ان کی نظر ہمیشہ مرکوز رہتی ہے۔سماج میں کوئی بھی ناسُور کہیں سے بھی سر ابھارتا ہے تو ان کے قلم میں جنبش ہوتی ہے۔ڈاکٹر اکبر حیدری ان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> ''مختصر افسانہ نگاری میں ساہو صاحب ایک منفرد مقام رکھتے

ہیں۔ اُن کے مکالمے اور کردار ہم جیسے ہیں یعنی ہمارے
معاشرے کے افراد۔ ہر افسانے کا پلاٹ مربوط ہے اور فنی
زبان، شیرین اسلوب، بیان دلکش اور دل آویز''۔
(گردشِ دوراں-حسن ساہو ص ۳۷۲)

رتن سنگھ کنول پہلگامی انگریزی زبان کے ریٹائرڈ لیکچرار ہیں۔ پانچ زبانوں یعنی اردو، پنجابی، ہندی، انگریزی اور پہاڑی زبان میں لکھتے ہیں۔ ان کی ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو میں افسانوی مجموعہ'' اجڑتے لمحوں کی کھیتیاں'' شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اردو افسانچہ میں پچھلی دو دہائیوں سے طبع آزمائی کر رہے ہیں۔

زنفر کھوکھر ضلع راجوری جموں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے تین افسانوں کے مجموعے ''خوابوں کے اس پار'' (1999ء) ''کانچ کی سلاخ'' (2004ء) اور ''عبرت'' شائع ہوئے ہیں۔ افسانوں کے ساتھ ساتھ افسانچے بھی لکھ رہی ہیں۔ عورت اور نظام تعلیم ان کے افسانچوں کے غالب موضوعات ہیں۔ صنف نازک کی لاچاری اور مجبوریوں کا کس طرح غلط فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، ان کو افسانوی اسلوب میں بیان کرنے کا فن زنفر کھوکھر کو خوب آتا ہے۔

زاہد مختار جموں کشمیر کا ایک ایسا تابندہ نام ہے جس نے ادب کے ہر میدان میں اپنی ایک پہچان بنائی ہے۔ ان کا پہلا ناول ''خوشبو کا سفر'' 1982ء میں شائع ہوا ہے۔ تین شعری مجموعے ''ابتدا'' 1984 میں'' سلگتے چنار 2004ء اور'' تشنگی'' 2005ء میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ افسانوں کا مجموعہ ''جہلم کا تیسرا کنارہ'' 2005ء میں شائع ہوا ہے۔ تنقیدی و تبصراتی مضامین، انشائیے اور خاکے بھی مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سو سے زیادہ ڈرامے

اور ٹی وی سیریز دوردرشن سرینگر کے لئے تحریر کئے ہیں۔کئی دہائیوں سے افسانچے بھی لکھ رہے ہیں۔ان کے افسانچوں کو ادبی حلقوں میں خوب سراہا جا رہا ہے۔شر پسند، فرق اور کتبہ ان کے بہترین افسانچے ہیں۔

فلک ریاض اردو کے نوجوان افسانچہ نگار ہیں۔ان کے افسانچے ملک کے موٴقر رسائل وجرائد اور اخبارات کے ادبی صفحات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔انہیں افسانچہ نگاری پر خاصی دسترس ہے۔واقعہ کو فکشنائز کرنا انہیں خوب آتا ہے۔معاشی بدحالی، بے راہ روی، منشیات وغیرہ ان کے افسانچوں کے خاص موضوعات ہیں۔ فلک ریاض شاعری بھی کرتے ہیں،اس لئے کم سے کم الفاظ میں بڑی بات کہنے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔

جنید جاذب کا تعلق راجوری سے ہے۔پیشہ کے لحاظ سے ہائر ایجوکیشن میں ماحولیات کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔اردو کے اہم رسائل مثلاً ماہنامہ شاعر، ماہنامہ انشاء، شیرازہ وغیرہ میں ان کے افسانچے شائع ہوئے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ آن لائن ادبی پورٹل جیسے لالٹین، دانش ڈاٹ کام، مکالمہ ڈاٹ کام، تفکر، پنج ند وغیرہ پر بھی ان کے افسانچے اپلوڈ ہوتے ہیں۔ان کا پہلا افسانچہ 2012ء میں کشمیر عظمیٰ کے ادبی اڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ان بارہ برسوں میں انھوں نے تقریباً پچاس کے قریب افسانچے تخلیق کئے ہیں۔یک طرفہ عشق، سوشل میڈیا وغیرہ ان کے افسانچوں کے خاص موضوعات ہیں۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی عصر حاضر کے معروف افسانہ نگار اور ناقد ہیں۔ان کے افسانوں کے دو مجموعے ''کالے پیڑوں کا جنگل'' اور'' کالے دیوؤں کا سایہ'' شائع ہوکر مقبول عام ہو چکے ہیں۔تنقید میں ان کی کتاب ''معاصر اردو افسانہ'' ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر رہی ہے۔اقبالیاتی ادب پر بھی دو کتابیں تصنیف کی

ہیں۔ادھر پچھلے کئی سال سے افسانچہ کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ چونکہ فن افسانچہ پر گہری نظر رکھتے ہیں،اس لئے ان کے افسانچوں میں کسی طرح کا سقم نہیں ہوتا۔ان کا افسانچہ، افسانچہ ہی ہوتا ہے،فکر پارہ،لطیفہ یا قول نہیں ہوتا۔ڈاکٹر توحیدی کا افسانچہ شروع سے آخر تک قاری کو اپنی جکڑ میں رکھتا ہے اور پنچ لائن ذہن کے دریچوں کو وا کر کے عقل وشعور میں سونامی پیدا کرتا ہے۔جنگل راج،سوشل جسٹس،ٹیکنالوجی،ایثار و رحم دلی،سماجی برائیاں،خدمت خلق ان کے افسانچوں کے خاص موضوعات ہیں۔

خالد بشیر تلگامی جموں کشمیر کے نوجواں افسانچہ نگار ہیں۔2016ء سے افسانچے لکھنے شروع کئے ہیں اور اسی سال ان کا پہلا افسانچہ روزنامہ ''تعمیل ارشاد'' کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوا۔ان کے افسانچوں کا مجموعہ ''دُکھتی رگ'' شائع ہوگیا ہے۔ کتاب میں شامل روٹی،خسارہ،روبوٹ،امداد،عقیدت،زہر وغیرہ ان کے بہترین افسانچے ہیں۔

راجہ یوسف کشمیر کے ضلع اننت ناگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''کاغذی پیرہن'' اور ''نقش فریادی'' شائع ہوئے ہیں۔ان کے افسانے اور افسانچے ہندو پاک کے معروف رسائل وجرائد میں اور اردو اخبارات کے ادبی اڈیشنز میں شائع ہوتے ہیں۔ اسٹیج اداکاری بھی کی ، ڈرامے بھی لکھے اور ڈاکیومنٹری فلمیں بھی بنائیں۔راجہ یوسف افسانچہ کے فن سے واقف ہیں۔افسانچہ کی تکنیک پر اچھی دسترس رکھتے ہیں۔نریشن نرالا ہے اور زبان پُر تاثیر۔راجہ یوسف اپنے افسانچوں میں سماج کے بہت اہم مسائل اور خرابیوں کی طرف دھیان بھی دلاتے ہیں اور ان ناسُور پر نشتر لگانے میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔

پرویز مانوس نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1985ء میں کیا ہے۔1995ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''شکاری کی موت'' منظر عام پر آیا۔ان کا دوسرا افسانوی

مجموعہ ''مٹھی بھر چھاؤں'' 2014ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دو ناول ''سارے جہاں کا درد'' اور ''برگشتگی'' بھی ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ 1995ء سے افسانوں کے ساتھ ساتھ افسانچے بھی لکھ رہے ہیں۔ پرویز مانوس چونکہ شاعری بھی کرتے ہیں اس لئے ان کو کم سے کم الفاظ میں کہانیاں بیان کرنے کا فن خوب آتا ہے۔

طارق شبنم کا تعلق ضلع بانڈی پورہ سے ہے۔ ''گم شدہ دولت'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ کئی ادبی تنظیموں سے وابستگی ہے۔ ہند و پاک کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانچہ کم ہی لکھتے ہیں لیکن جتنے بھی لکھے ہیں افسانچہ کے فن پر پورے اترتے ہیں۔

راقم بھی افسانچے تخلیق کر رہا ہے۔ 2005ء سے میرے افسانچے رسائل اور اخبارات کے ادبی اڈیشنز میں شائع ہو رہے ہیں۔ احترامِ انسانیت، اصلاحِ نفس اور کشمیریت میرے افسانچوں کے خاص موضوعات ہیں۔ کئی ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی تھیسز میں میری افسانچہ نگاری پر ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ ''آدمی مسافر ہے'' کے عنوان سے افسانچوں کا مجموعہ بہت جلد منظر عام پر آ رہا ہے۔

رواں صدی کی دوسری دہائی کے بعد جموں کشمیر میں اردو افسانچہ نگاروں کی فہرست میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ جموں کشمیر میں اردو افسانچہ کے فروغ میں جہاں مقامی رسائل اور اخبارات اہم رول ادا کر رہے ہیں، وہیں سوشل میڈیا کے ذریعے بھی یہاں کے افسانچہ نگار اردو دنیا میں متعارف ہو رہے ہیں۔ آنے والا وقت ہی فیصلہ کرے گا کہ عالمی سطح پر اردو افسانچہ نگاری میں مقامی افسانچہ نگار کس قدر اپنا کردار ادا کریں گے۔

☆☆☆

افسانچہ: مشاہیر کی نظر میں

جوگندر پال:

افسانچے کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ ایک چپ ہی چپ میں ساری بات ہو لیتی ہے اور قاری اسے پڑھ کر گویا افسانچہ نگار کو سمجھانے لگتا ہے۔۔۔نہیں، آپ کی کہانی یہ بیان نہیں کر رہی ہے جو آپ بتا رہے ہیں۔ بیٹھیے، میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ آپ کی کہانی دراصل یہ کہہ رہی ہے کہ۔۔۔اور افسانچہ نگار قاری کو بغور سن کر بڑی طمانیت سے جواب دیتا ہے۔۔۔ہاں! واقعی، یہی تو!۔۔۔افسانچے کے اختصار کا اہم ترین پہلو یہی ہے کہ اس کے معانی افسانچہ نگار کے دوٹوک فیصلے کی بجائے قاری کے تخلیقی تجسّس سے انجام پاتے ہیں۔

-------☆-------

ڈاکٹر رضوان احمد:

افسانچہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دل کش شعر کی طرح ذہن سے چپک کر رہ جاتا ہے۔ جس طرح غزل کا شعر ذہن و دل میں اتر کر بہت عرصہ تک کچوٹتا رہتا ہے اسی طرح سے افسانچہ بھی ذہن میں جاگزیں ہو جاتا ہے اور بار بار قاری کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ اس طرح کے کئی افسانچے مجھے یاد ہیں۔

-------☆-------

عبداللہ جاوید (کینیڈا):

افسانچہ اپنے نام کی نسبت سے ایسے افسانے کو کہا جاتا ہے جو بے حد مختصر ہو لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیائے ادب میں افسانچہ اس زمانے (آج سے ہزاروں برس پہلے) سے موجود ہے جب افسانے کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ یونانی ادب میں ایسوپ AESOP کی کہانیاں فیبلس FABLES ملتی ہیں جو ایک یونانی غلام تھا۔ یہ دراصل ایسے افسانچے، مختصر کہانیاں تھیں جو کسی اخلاقی درس پر منتج ہوتی تھیں۔ ان میں دانش اور آموزش کسی دل چسپ کہانی کی صورت میں پیش کی گئی ہوتی تھی۔ ایسوپ کی کہانیاں دنیا کی ہر قابل ذکر زبان میں آج بھی مقبول خواص و عوام ہیں۔ عربی زبان میں ایسی مختصر حکایات مل جاتی ہیں جو زندگی کے دانش ورانہ مشاہدے کا نچوڑ ہیں، ان میں طنز ومزاح کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ فارسی میں حکایات سعدی اسی انداز کی ہیں۔ مثنوی مولانا روم میں بھی ایسی مختصر تمثیلیں موجود ہیں۔ بیشتر سریانی زبانوں بلکہ سارے مغربی ادب میں ایسوپ کی حکایات کے علاوہ بھی اس قبیل کی حکایات اور تمثیلیں موجود ہیں۔ ہندوستان میں بھی خاص طور پر بدھسٹ فکر سے مربوط مختصر کہانیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔

-------☆-------

ڈاکٹر کیول دھیر:

مختصر کہانی لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ایک واقعہ، ایک خیال، ایک لمحہ ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے جو ذہن میں سماتے ہی شدّت اختیار کر لیتا ہے۔ کہانی کار اسے جب کہانی کا روپ دیتا ہے تو اس کی ذہنی سوچ اسی تیز رفتاری اور شدّت کے ساتھ کردار کی انگلی تھامے قلم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے

ہیں کہ مختصر کہانی کا جنم شدید ردِ عمل، گہری سوچ اور جذباتی شدّت سے ہوتا ہے۔ اختصار کی تکنیک اگر قلم کار کے پاس موجود ہوتو کردار ننھی منی کہانی میں ڈھل جاتا ہے۔

-------☆-------

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی:

اردو میں افسانہ نگاروں کی بھیڑ ہے۔لیکن تیز رفتار زندگی اور الیکٹرونک میڈیا کی کشش کی وجہ سے افسانہ کے قاری سمٹتے جارہے ہیں۔ایسے میں افسانچہ پر توجہ مرکوز ہورہی ہے اور افسانچہ نگاروں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔

-------☆-------

رؤف خیر:

ایک زمانہ تھا اے آر خاتون، شمع خاتون وغیرہ ناول نگاروں کے ایک ایک ہزار صفحات پر مشتمل ناول بھی بعض لوگ بڑے اشتیاق سے پڑھا کرتے تھے۔ان دنوں ترقی معکوس کا یہ عالم ہے کہ یک سطری کہانیاں لکھی جانے لگی ہیں۔اس میں شک نہیں الیکٹرانک میڈیا کے مصروف ترین انسان کے لیے سینکڑوں صفحات کی ورق گردانی ممکن نہیں مگر وہ بہرحال اتنا بھی عدیم الفرصت نہیں کہ صرف ایک لائن کی کہانی پڑھ کر تشفی پا جائے۔

-------☆-------

احمد صغیر:

افسانچہ لکھنا تلوار پر ننگے پاؤں چلنے کے مترادف ہے۔افسانچہ نگار کے لیے یہ خطرہ ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں یہ لطیفہ نہ بن جائے یا شعر کا کوئی ٹکڑا نہ سمجھ لیا جائے لہٰذا افسانچہ لکھنے میں زیادہ محتاط رہنا پڑتا ہے۔ایک افسانچہ نگار کو پھر بھی اُردو

فکشن میں وہ مقام نہیں مل پایا جس کا وہ مستحق ہے۔

-------☆-------

مراق مرزا:

میری نظر میں افسانہ نویسی کے مقابلے افسانچہ نگاری کا فن قدرے مشکل ہے۔افسانہ کا تخلیقی عمل اپنے خالق کو کرداروں پر روشنی ڈالنے اور واقعات وحادثات کی مختصر وضاحت کے لیے مہلت دیتا ہے۔افسانہ میں پس منظر کے بیان اور مکالموں کی بھی حد تک گنجائش ہوتی ہے مگر افسانچہ محض چند سطروں میں ایک مکمل خیال اور پوری کہانی کے Narrative کا متقاضی ہوتا ہے۔

-------☆-------

احسان سہگل (ہالینڈ):

مختصر تحریر میں اپنی بات کا مفہوم ظاہر کرنا سب سے بڑی خوبی ہے۔شاعر ہو یا فسانہ نگاری اس گہما گہمی کے دور میں ہر شخص انتہائی مصروف زندگی گذار رہا ہے۔ طویل اور ثقیل چیزیں آج کا دماغ قبول نہیں کرتا۔کوئی تخلیق یا بات مختصر ہے تو ہر کوئی متوجہ ہوتا ہے۔ایک نظر ڈالنے میں کوئی مشکل محسوس نہیں ہوتی۔

-------☆-------

خورشید اقبال:

افسانچہ اردو ادب کی مشکل ترین اصناف میں سے ایک ہے۔ کیوں کہ افسانہ نگاری محض قصہ گوئی نہیں ہے اور بھی بہت کچھ ہے۔ یہ ایک جدید صنف ہے جس میں اختصار سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں اپنی بات کو کم سے کم الفاظ میں اس

طرح بیان کرنا ہوتا ہے کہ مدعا واضح ہو جائے۔ اختصار کے ساتھ ساتھ نئے افسانے میں ابہام بھی بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ افسانہ نگار سب کچھ کھل کر بیان نہیں کرتا بلکہ بہت کچھ قاری کی اپنی فراست پر چھوڑ دیتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر پہنچ کر قاری خود بخود نتیجہ اخذ کر لیتا ہے اور بات کی تہہ تک پہنچنے کے بعد اسے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہی افسانہ نگار کی اصل کامیابی ہے۔

-------☆-------

☆......نور شاہ

انتظار

دیکھو نائلہ میں گھر سے باہر جا رہا ہوں۔ دیر ہو سکتی ہے لوٹ کر آنے میں رات بھی لگ سکتی ہے، تم بالکل نہ گھبرانا...... دراصل ایک بہت ضروری کام آن پڑا ہے، دوستی نبھانے کا معاملہ ہے، میں اپنے ایک دوست کے ہاں جا رہا ہوں، میرا وہ دوست محکمہ ایکسائز میں کام کرتا ہے، دوسرے درجے کا ملازم ہے لیکن ہے بڑا شاطر اور چالاک، ہر کام میں ماہر ہے۔ وہ مجھے افیم سے بھرا ایک پیکٹ دے رہا ہے، وہ پیکٹ میں اس کے افسر کے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں، کوئی بہانہ بنا کر میں اس کے گھر کے اندر چلا جاؤں گا تم تو جانتی ہو کہ بہانے بنانے مجھے بخوبی آتے ہیں......سنو تو سہی، اس آفیسر نے میرے دوست کی ترقی روک رکھی ہے، کیونکہ اُنہیں میرے دوست کے خلاف کافی شکایتیں مل چکی ہیں جن کی وہ چھان بین کر رہا ہے...... ہاں ہاں شکایات درست ہیں بڑا چاپلوس قسم کا آدمی ہے میرا دوست......رشوت لئے بغیر کوئی کام نہیں کرتا...... میری بات تو سنو، آفیسر کے گھر افیم کا پیکٹ ڈالنے کے فوراً بعد میں تو چلا آؤں گا لیکن میرا دوست پولیس کی مدد سے وہ پیکٹ برآمد کر کے اُس آفیسر کو...... باقی کہنے کی ضرورت نہیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، تم سمجھ گئی نا ارے نا سمجھ، آفیسر پکڑا جائے گا افیم رکھنے کے جرم میں ...... ہاں چلتا ہوں اب......تم بالکل نہ گھبرانا۔

ابھی وہ اپنے گھر سے دو قدم بھی نہ چلا تھا کہ ایک گلی سے چند سپاہی نمودار

ہوئے۔افیم کا کاروبار کرنے کے جرم میں مزید پوچھ تاچھ کے لئے پولیس سٹیشن لیا گیا......ادھراس کا شاطراور چالاک دوست دوسری گلی سے نمودار ہوا،اپنے ایک ہاتھ میں گل دستہ اور دوسرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھامے اس کے گھر میں داخل ہونے لگا جہاں نائلہ بےصبری سے اس کا انتظار کررہی تھی۔!!!

............●●● ....

تجربہ

''دیکھواختر''ایک شام عالیہ نے کہا۔''تم دوسری شادی کرلو،آخرکوئی تو چاہیے اتنی بڑی جائیداد کوسنبھالنےاورسمیٹنے کے لئے۔''

''میں دوسری شادی نہیں کرسکتا،ایساممکن بھی نہیں ہے''اختر نے کہا۔

''ایسا کیوں ممکن نہیں، میں تمہیں اجازت دے رہی ہوں......اور یقین کرو اختر میں اسی طرح تم سے پیار کرتی رہوں گی......''

''عالیہ میں اپنی کمزوری سے واقف ہوں۔ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میں بچہ پیدا نہیں کرسکتا......لیکن میں کئی روز سے ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔''

''کیا سوچ رہے ہو اختر۔''

''تم سے کہتے ہوئے ڈر سا لگ رہا ہے۔''

''ڈر کیوں اور کس بات سے۔''

''تم......تم گھر کے کسی نوکر یا کسی دوست سے......کسی کو پتہ نہیں چلے گا اور

بدنامی بھی نہ ہوگی ؟!'' اور عالیہ من ہی من میں سوچنے لگی.....'' اب میں اختر کو کیسے بتاؤں کہ میں اس تجربے سے پہلے ہی گزر چکی ہوں!

............●●● ....

فرض شناسی

منی آج بھی رو رہی تھی!

''دیکھو منی''۔ ماں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا.....''تمہارے ابو جان اِن دِنوں بھونچال سے متاثر لوگوں کی دیکھ بھال کرنے میں مصروف ہیں، بہت سارے لوگ بے گھر ہو چکے ہیں، اُن کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے بہت سارے اِنتظام کرنے پڑتے ہیں تیرے ابو تو، ریلیف کمیٹی کے صدر ہیں، راحت کے کاموں سے اُنہیں فرصت تو ملنے دو......اب سو جاؤ میری اچھی منی!''

منی نے روتی ہوئی نگاہوں سے اپنی ماں کی جانب دیکھا اور اپنے معصوم سے لہجے میں کہا۔''امی میں یہ نہیں مان سکتی......کل تو ابو دو کنستر گھی اور ایک بوری آٹا لائے تھے اور آج وہ چھ نئے نئے کمبل لائے ہیں، لیکن میری گڈیا لانا بھول گئے۔!''

............●●● ....

☆......ویریندر پٹواری

سوال

آشا میری اکلوتی بیٹی ہے......میں آشا سے بہت پیار کرتا ہوں......میں آنکھوں کا مشہور ڈاکٹر ہوں۔۔

آپریشن کامیاب ہے اور چند گھنٹوں کے بعد آشا بیٹی سب کچھ دیکھ سکے گی۔ واہ...... واہ یہ کمرہ، یہ مکان ،......وہ سڑکیں،...... پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیاں، ......ابلتے چشمے،......گرجتے دلکش آبشار،......لہلہاتے کھیت،......ڈیم ،فیکٹریاں...... اور اسکا مرجھایا ہوا چہرہ ایک پھول کی طرح کھل اٹھے گا......واہ! مگر......؟اف......!!

اس وقت سات بجے ہیں...... بلیک آوٹ آٹھ بجے ہے اور نو بجے جب میں آشا کی پٹّی کھول دوں گا......تب ہر طرف ڈراؤنا اندھیرا چھایا ہوگا۔سکوت کا عالم ہوگا...... اور...... کوئی ایٹمی دھماکوں کی آواز سن رہا ہوگا...... کوئی قہقہے......کوئی آہیں......کوئی ریڈیو کو کان سے لگائے امریکہ، روس، ایران، افغانستان، چین کی خبریں سنتا ہوگا......اور میں فقط اپنے پھولتے سانسوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی کرتے ہوئے گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز سن رہا ہوں گا...... بےبس......لاچار......دل شکستہ......شکست خوردہ...... میں سوچ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد آشا کی پٹیاں کھل جائینگی......لیکن اس اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آئیگا......وہ گھبرا جائیگی اور مجھ سے یہی سوال کرے گی۔

"مجھے کچھ دکھائی کیوں نہیں دے رہا ہے پاپا۔۔؟"

میں اس سے کیسے کہونگا کہ مجھے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے......اف!!

............●●● ....

طوطا

پنجرے سے آزاد ہو چکے پالتو طوطے نے اپنی رٹّی ہوئی باتیں سناتے ہوئے بار بار اپنے مالک کی کارکردگیوں کا حوالہ دیکر کوّے کو مستقبل میں ایک ہوکر رہنے کا یقین دلایا تو کوّے نے بیباک ہوکر پوچھا کہ کیا کوئل کو سمجھایا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے گھونسلے میں گھس کر، اس کے انڈے باہر پھینک کر، دھوکے اور چالاکی سے اپنے انڈے رکھنا بند کردے!؟

''کیا تمھیں میرے آقا کی پسندیدہ کوئل کی کوک اچھی نہیں لگتی؟''

طوطے نے رٹّا ہوا جملہ بول کر کوّے کو چونکا دیا!— کوّا ایک عام ووٹر کی طرح خاموش رہ کر، طوطے کو اپنے مالک کے اشارے پر واپس اپنے پنجرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر یوں چونک پڑا جیسے الیکشن کا نتیجہ سن کر خوفزدہ ہو چکا ہو!!

............●●● ....

انجام

میں سمندر کی اس پراسرار خاموشی کی بات نہیں کر رہا ہوں، جو ایک آنے والے طوفان کی اطلاع دیتی ہے۔ میں ہروشما اور ناگاساکی کے اکھڑ چکے وجود کی

عبرت ناک خاموشی کے حوالے سے قہرآدم کی اطلاعات نہیں دینا چاہتا ہوں۔ میں سرحد پر جنگی طیاروں کی گڑگڑاہٹ اور سایرَن کی گونج سن لینے کے باوجود اجڑے گاوں کی خاموشی کو جیت کا عنوان نہیں دے سکتا ہوں!

کرونا وایئرس کے قہر کو شمشانوں اور قبرستانوں کی المناک خاموشی سے بیان نہیں کر پاوں گا! مگر کرونا ایئرس کی دوسری لہر سے ابھری مہاماری کے قہرِ آدم سے بچاو کی حفاظتی احتیاط کو نظر انداز کرنے والے دھرنوں میں شامل بھیڑ کی اشتعال انگیز نعروں اور ٹریکٹروں کی گڑگڑاہٹ کا شور اور گمراہ ہو چکے ہم وطنوں کی رہبری کرنے والے ان کے خود ساختہ محافظ اور اشرف المخلوق ہونے کے دعویداروں کی مشکوک خاموشی کے حوالے سے ایک بہت بڑے طوفان کی اطلاع دے کر ان کے عبرت ناک انجام سے میں خوفزدہ ہو چکا ہوں!!

............●●● ....

☆......خالد حسین

حرص کا سفر

میں نے ایک ایسی عمارت بنائی جو سورج سے چند قدم دُور تھی۔ اس بلڈنگ کو دنیا کا نواں عجوبہ مان لیا گیا تھا۔ خلقت میرے گن گا رہی تھی۔ اب میں خوش تھا اور مطمئن بھی۔ میرے پاؤں دھرتی سے اوپر خلا میں اُڑ رہے تھے۔ میں اُڑتا اُڑتا اُس عمارت کی چھت پر جا بیٹھا جو میں نے بنائی تھی اور دنیا کو دیکھنے لگا......لیکن دنیا مجھے کہیں دیکھائی نہ دی۔ خلقت کا کوئی وجود نہ تھا۔ صرف میں تھا اور کوئی نہ تھا۔

دھرتی کے ساتھ میرا رشتہ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے زمین پر اترنے کی لاکھ کوشش کی لیکن مجھے کوئی راستہ نہ ملا۔ زمیں کی اونچی عمارت کی چھت پر اکیلا رہ گیا۔ میں اپنے ہی کرموں کے فریب میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

............●●● ....

قیامت

سات پیالے مٹی کے الگ الگ رنگوں کے منقش اس کی بخشی ہوئی خیرات اور میں بھوکا پیاسا صدیوں کا۔ ایک رنگ کا کشکول لئے۔ خالی خالی تنہا تنہا کسی نے مجھ

کو بھیک نہ دی۔ کسی نے میرا رنگ نہ دیکھا۔ میں ویران جنگلوں کا مسافر گمنام وادیوں میں بھٹکتا رہا نسل در نسل صدی تا صدی۔

پھر اک جرات رندانہ سات پیالے مٹی کے الگ الگ رنگوں کے منقش ٹوٹ گئے اور میں ایک سمندر بن گیا۔ اس دن سے اس نے گلے میں ایک تختی لٹکالی جس پر لکھا تھا۔ قیامت آ گئی ہے۔

............●●● ....

لال پری

وہ لال پری۔۔۔ اکیلی۔۔۔ چوراہے پر کھڑی گاہک ڈھونڈتی رہتی ہے۔ اُس نے سر پر کالا سکارف باندھا ہوا ہے اور کمر پر پیلی دھاریوں والی چادر اوڑھی ہوئی ہے جس پر لکھا ہوا ہے کہ یہاں کوئی بھی شخص کسی بھی وقت لال پری کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرسکتا ہے۔ دن بھر طرح طرح کے نمونے اُس کے پاس آتے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں پکڑے رنگ برنگے کبوتر اُس کے پیٹ میں ڈال کر چلے جاتے ہیں۔ پھر دن چڑھے اور شام ڈھلے ایک شاہ مار آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اُس کے پاس آتا ہے اور اُس کے نچلے دھڑ کو چیر کر سارے کبوتر نگل جاتا ہے اور اس کے پیٹ کو اپنی زبان سے چاٹ کر چلا جاتا ہے۔ وہ لال پری چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے۔ منہہ سے کچھ نہیں بولتی لیکن اُس کی آنکھیں کہتی ہیں:

''میرا آپریشن کر کے میرا لنگ نہ بدلو۔ مجھے کہاگن رہنے دو کیوں کہ سہاگن ہونا ایک عورت کی پہچان ہے۔''

پر لال پری کو کون سمجھائے کہ کمپیوٹر کے دور میں شبدوں کے ارتھ ہی بدل چکے ہیں۔ پرانی چیزوں کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔آج جسمانی تعلقات کی بجائے مصنوعی طریقوں سے حمل کرایا جاتا ہے تو پھر جسمانی رشتوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کوئی رشتے بنانے کے لیے منت سماجت کیوں کرے۔آج کے اس ٹیکنالوجی کے دور میں ہم بے پرواز کبوتروں کو کیوں چوگ ڈالتے رہیں۔ہم نئے دور کے غازی ہیں۔ ہم لال پری کے ساتھ کسی قسم کا سمبندھ نہیں رکھنا چاہتے کیوں کہ ہم سرشٹی کو آنکھ کے پلکارے میں فتح کر سکتے ہیں۔

............●●● ....

☆......وحشی سعید

خودسری

وہ رات لمبی اور اذیت ناک تھی۔ کبر کے جھرمٹ میں زندگی کی ساعتوں کو جب اس نے دم توڑتے ہوئے دیکھا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ کہیں کسی حسین شاہکار کی تکمیل کے لیے بھیانک اندیشے بھی زندگی کے ساجھی دار بنتے ہیں۔ وہ دیر تک اپنے دل کو آنے والی دلفریب آشاؤں سے بہلاتا رہا۔ پھر اچانک کسی نے اسے خواب شیریں سے جگایا۔ وہ سفید گون پہنے ہوئے قدآور شخص اپنی آواز میں کہنے لگا۔

کیا یہ ضروری ہے کہ تمہاری خودسری تمہارے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔

لیکن......!!

قدآور شخص نے آگے کہا:

''شاہکار کا بننا تو دور کی بات ہے اب تو معمار بھی ٹوٹ گیا۔''

وہ اندیشے جواب تک حقیقت سے بعید تھے اس نے اپنی خودسری سے ان میں جان ڈال دی۔

............●●● ....

پہچان

وہ اپنی انا کے سامنے اپنے مزاج کی خودسری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں

تھا۔ یہ کشمکش اس کی ذات کے لیے بڑی تلخ اور تکلیف دہ تھی۔ اب وقت کے ساتھ یہ احساس بھی حاوی ہونے لگا کہ اپنے سرمایہ حیات کا سب سے حسین بت خود مسمار کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس لمحے اس نے اپنے دل کو نیزہ کی نوک پر محسوس کیا۔

بت نے کہا:

وہ ٹوٹتا رہا۔

آہستہ آہستہ خود سپردگی کا عنصر اس پر قابو پانے لگا۔ وہ جب اپنے بت کو چھونے لگا......!!

تم کون؟''

میں یوسف!

اس نے بہت آہستہ سے بت کے کان میں کہا۔

تم یوسف نہیں ہو......

اور یوسف بے بسی سے رات کی سیاہی میں اپنے وجود کی پہچان کو گمنامی کے اندھیروں میں کھوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

............●●●............

گمراہی

جب اس نے اپنے پاؤں ریشمی دبیز قالینوں پر رکھے تو یوں محسوس ہوا کہ جنت کا پہلا نشان ملا۔

وہ سنگ مرمر کے عالیشان محل میں اپنے ماضی اور حال کی ان گنت الجھنوں کو یاد کرنے لگا، جن سے فرار حاصل کرنے کے لیے جتن کر رہا تھا۔ اطلس اور کم خواب

کے سجے ہوئے فرنیچر، بلور کے فانوس، چاندی کے برتن ...... جب یہ سب اس کی نظروں میں آ گئے تو اسے اپنے مستقبل کے ہولناک اندھیرے اور بھی گہرے ہوتے ہوئے نظر آنے لگے۔ شہنشاہی کرسی پر براجمان اپنے دربان کے نکلس سے کھیلتے ہوئے کہنے لگا:

یہ سب حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اپنی... آنکھوں کو خود ہی بینائی سے محروم کرنا ہوگا۔

لیکن......وہ بے بس آواز میں بول پڑا۔

''سوچ ترقی کے لیے مضر ہے۔''

وہ شخص کھڑا ہوا۔ اور اپنی آہنی سیف میں اس کی بینائی کو محفوظ رکھ لیا۔ اب وہ اندھا آدمی اپنی گمراہی پر آنسو بھی نہیں بہا سکتا۔

............●●● ....

☆......حسن ساہو

برقع پوش

بھلا ہواس برقع کا......۔

پرسوں دفتر سے نکل کر بھرے بازار سے گذر رہا تھا کہ سامنے بڑے چوک کے نکڑ پر لوگوں کی بھیڑ دیکھنے کو ملی۔ حقیقت حال سے باخبر ہونے کی خاطر آگے بڑھا۔ ایک وجیہہ اور خوب رو جوان برقع پوش خاتون کو اپنی منگیتر جتا رہا تھا، ساتھ ہی دوسرے شخص کا دعویٰ تھا کہ مذکورہ خاتون اُس کی بیوی ہے۔ دونوں میں تُوں تُوں میں میں ہوتی رہی اور لوگ تماشہ دیکھنے میں مشغول ہو گئے۔

اتنے میں ایک عمر رسیدہ شخص خاتون سے مخاطب ہوا۔

''بیٹی ذرا تم ہی معاملے پر روشنی ڈالو! آخر اصلیت کیا ہے؟''

یہ سننا تھا کہ برقع پوش خاتون بپھر گئی اور نفرت آمیز لہجے میں زبان وا کر دی۔

''ان دونوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں''۔

یہ کہہ کر اس نے برقع کا اگلا پٹ اُلٹ دیا اور دونوں جوانوں پر جیسے بجلی گری۔

وہ ایسے غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ متذکرہ خاتون کانی تھی اور اس کا چہرہ چیچک کے داغوں سے لبریز!

............●●●............

کباڑیا

لال دین ایک کباڑیا تھا۔

دن پھرٹوٹا پھوٹا سامان، ردی کاغذ، ناکارہ ٹین اور پرانے اخبارات گھر گھر جا کے جمع کرتا اور شام کو فروخت کر کے معمولی رقم وصول کرتا۔ بیوی بچوں کے ساتھ برائے نام گذارہ ہوتا تھا۔

کچھ برس گذرنے کے بعد لال دین کی کایا اچانک پلٹ گئی۔ دولت اس کے قدم چومنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی خستہ جھونپڑی ایک عالیشان کوٹھی میں بدل گئی۔ ہر طرح کا سکھ لال دین کو حاصل ہونے لگا۔

دراصل اب لال دین آفیسروں، بیروکریٹوں اور منسٹروں کے بنگلوں کے چکر لگایا کرتا تھا۔ جہاں خالی کیئے ہوئے قیمتی بریف کیس مٹی کے مول ملتے تھے اور وہ بازار میں ان کو اچھے داموں فروخت کرتا تھا۔

............●●● ....

المیہ

رمضان بابا کا اکلوتا بیٹا نذیر منڈی سے سبزی خرید کے ریڑھی میں لبستی لبستی جا کے فروخت کرتا تھا۔ بوڑھے والدین کا واحد سہارا نذیر تھا۔ ایک دفعہ ریڑھی لے کر سبزی منڈی جارہا تھا کہ بڑے بازار کے نکڑ پر تیز رفتار ٹرک نے ٹکر ماردی۔ نذیر بڑے

پتھر سے جا کر ٹکرایا، بائیں کاندھے اور کنپٹی میں چوٹ آئی تھی۔ خون فوارے کی صورت بہہ رہا تھا۔

ہسپتال میں ڈاکٹروں نے خون کا بندوبست کرنے کو کہا۔ رمضان بابا بے بسی کے عالم میں رہ چلتے ایک ایک فرد سے خون کی بھیک مانگتا رہا لیکن اس کی فریاد صدا بہ صحرا ثابت ہوگئی......اور نذیر بوڑھے باپ کی گود میں دم توڑ بیٹھا۔

شام کو بیٹے کو دفنانے کے بعد رمضان بابا واپس گھر آ رہا تھا کہ نیلم چوک میں کھل بلی مچی تھی۔ آنِ واحد میں جمع بھیڑ پر لاٹھیاں اور گولیاں برسائیں گئیں دیکھتے ہی دیکھتے سارا چوک خون میں سیراب ہو گیا۔

افسوس انسانی جان بچانے کے لئے کسی نے خون کا ایک قطرہ نہ دیا اور جذباتی ڈگر سے وابستہ شاہراہ کو اسی خون سے رنگین کیا گیا۔

...........●●● ....

☆......دیپک بدکی

احتجاجی تختی

اس بچی کے گلے میں ایک احتجاجی تختی بندھی ہوئی تھی۔
میری شریک حیات اس کو دیکھ کر پریشان ہوگئی ،تھوڑی دیر رُکی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ’’بے چاری نہ جانے کتنے دنوں سے بھوکی ہوگی۔ کاش کسی نے کھانے کو کچھ دیا ہوتا۔‘‘
’’تم بھی کتنی سادہ لوح ہو۔ انھوں نے سوشل میڈیا پر اپنے ویڈیو کو وائرل کرنے کے لیے اس بچی کو لالچ دے کر یہ پلے کارڈ گلے میں ڈال دیا ہے۔ ورنہ یہ تو ان پڑھ ہے، اس کو کیا معلوم کہ اس تختی پر کیا لکھا ہوا ہے۔‘‘
وہ میری بات سمجھ گئی اور آگے بڑھ گئی۔

............●●● ....

کتب خانہ

بہت عرصے کے بعد اشرف علی کو یہ احساس ہوا کہ اس کے گھر سے علم کا ذخیرہ ہی چلا گیا۔ وہ جب کبھی کسی بات کو نہیں سمجھتا تھا تو فوراً اپنے دادا کے پاس جا کر اس کا حل پوچھ لیتا، چاہے وہ زندگی کے بارے میں ہوتی یا پھر نصابی کتابوں کے

بارے میں۔

تجربہ کار دادا اس کی مشکل چٹکیوں میں حل کر دیتا۔

اتنی مدت کے بعد اسے اس قول کا مفہوم سمجھ آیا کہ بوڑھا مر جائے تو اس کے ساتھ ایک کُتب خانہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

............●●● ....

دیانت داری

سعیدالدین کی تبدیلی غیر متوقع طور پر بہت جلدی ہوگئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ سارے اسٹاف میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ رازدارانہ طور پر ایک معتمد سے اس بارے میں پوچھ لیا تو جواب ملا: ''سر، ایک دیانت دار افسر کو سبھی ملازم عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے بارے میں تعریفوں کے پل باندھتے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ کبھی ان کا افسر بن کر آئے۔''

دراصل خلوص، شرافت اور دیانت داری موجودہ زمانے میں انسان کے سب سے بڑے عیب ہیں۔

............●●● ....

☆......ڈاکٹر نذیر مشتاق

مسئلہ

اب تو تمہیں خوش ہونا چاہیے تمہیں ایک جیون ساتھی مل گیا اب تم اس کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی کے شب و روز گزارنے کی کوشش کرو۔۔۔شاہدہ نے اپنی سہیلی رضیہ سے کہا۔۔رضیہ نے جواب دیا۔۔۔۔

تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو مگر۔۔۔۔۔۔۔شاہدہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔۔۔۔اگر مگر چھوڑ دو۔ بھول جاؤ کہ اس سے پہلے کبھی تمہاری شادی ہوئی تھی اور شادی کے دو سال بعد تمہارا شوہر لاپتہ ہوا تھا۔تم نے پورے آٹھ سال اس کے انتظار میں گزارے۔وہ نہیں آیا تو تمہارے ماں باپ نے تمہاری شادی کروادی۔۔اب کیا مسئلہ ہے۔شاہدہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔۔۔۔

رضیہ نے کہنا شروع کیا۔ شاہدہ تمہیں معلوم ہے کہ میں اس سے؟۔
شاہدہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔۔۔۔مجھے معلوم ہے وہ تمہارے بچپن کا ساتھی تھا اور تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جنوں کی حد تک پیار کرتے تھے۔مگر وہ لاپتہ ہو گیا۔تمہیں زندہ رہنے کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہے وہ تمہیں مل گیا۔اب کیا مسئلہ ہے شاہدہ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔رضیہ نے شاہدہ کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

مسئلہ یہ ہے میرے بچپن کا ساتھی ،میرا پیار، میرا پہلا شوہر آٹھ سال لاپتہ رہنے کے بعد صحیح سلامت واپس آیا ہے۔ ●●●

ورثہ

بھولا رام اسپتال کے اسکورٹی گارڈ کو چکمہ دے کر کووڈ وارڈ کے اندر چلا گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے چہرے سے ماسک ہٹایا اور زور زور سے سانس لینے لگا۔ چند لمحے وہ وارڈ کے بیچ میں کھڑا رہا۔ وارڑ کی انچارج نرس نے اسے دیکھا تو اس کا بازو پکڑ کر اسے باہر لے آئی۔۔۔مرنا ہے کیا۔نکلو یہاں سے۔

ایک ہفتہ بعد بھولا رام بخار سے تپنے لگا وہ بے حد کمزوری محسوس کرنے لگا وہ سمجھ گیا کہ وہ کووڈ بیماری میں مبتلا ہو چکا ہے۔۔۔اس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔۔۔۔اس نے اپنی بیوی اور بچوں سے کچھ نہیں کہا۔

وہ ایک مہینے سے بیکار تھا گھر میں کھانے پینے کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ اسے اپنی بیوی بچوں سے بہت پیار تھا۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اب وہ کچھ نہیں کما سکے گا اور اس کی بیوی اور بچے بھوک سے مر جائیں گے۔۔۔۔ایک دن پہلے اس نے اپنے ایک ہمسایہ سے سنا تھا کہ ان کے گاؤں میں ایک منتری آیا تھا جس نے یہ وعدہ کیا ہے کہ اس گاؤں میں جو بھی کووڈ بیماری سے مر جائے گا اس کے وارثوں کو پچاس ہزار روپے نقد اور ماہانہ ایک ہزار روپے دیا جائے گا۔

اس کی بیوی اس کے قریب آ گئی اور کہا۔۔۔۔گھر میں کچھ بھی نہیں ہے کیا کروں۔بچے بھوکے ہیں۔

تو گھبرا مت لکشمی سب ٹھیک ہوگا۔ میں نے سب انتظام کیا ہے بس ایک دو دن انتظار کرو تجھے اتنے روپے ملیں گے کہ تو اپنے بچوں کے ساتھ عیش کرے گی، یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔۔

....●●●

سیاہ وسفید

شبانہ بائی الہ آباد والی کے کوٹھے پر کام کرنے والا سلو میاں اپنے دوست یوسف میاں کے ساتھ مسجد ابوتراب میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے آیا تھا۔مسجد کا امام سفید برف جیسے لباس میں ملبوس تھا۔ وہ عورت اور مرد کے پاک رشتے پر مذہبی نظریہ بیان کر رہا تھا۔۔۔سلو میاں گھٹنوں میں سر دبائے ہنس رہا تھا۔۔۔اس کے دوست یوسف میاں نے دو تین بار اسے نہ ہنسنے کا اشارہ کیا مگر سلو میاں کی ہنسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔۔۔

نماز کے بعد مسجد سے باہر آ کر یوسف میاں نے اس کی خوب خبر لی۔مسجد کے تقدس کا تمہیں ذرا بھی خیال نہیں۔۔۔امام صاحب عورت اور مرد کے پاک رشتے کے بارے میں۔۔۔۔۔یوسف میاں کی بات کاٹ کر سلو میاں نے قدرے غصے سے کہا۔۔۔ارے وہ امام کیا سمجھائے گا مجھے۔عورت اور مرد کا مقدس رشتہ۔۔۔میں نے اسے اکثر عشاء کی نماز کے بعد کوٹھے پر آتے دیکھا ہے۔۔۔وہ وہاں سیاہ رنگ کا لباس پہن کر آتا ہے۔۔۔ ایک دن مجھ سے اچانک ٹکرایا، اس کے چہرے سے مفلر ہٹ گیا اور میں نے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔۔۔۔۔تم بھی دیکھنا چاہو تو آج عشاء کی نماز کے بعد کوٹھے پر آ جانا۔۔۔۔۔اچھا چلتا ہوں۔ یہ کہہ کر سلو میاں چلا گیا۔۔۔۔

عشاء کی نماز کے بعد دونوں کوٹھے کے ایک طرف چھپ کر امام صاحب کا انتظار کرنے لگے۔۔۔تھوڑی دیر کے بعد وہ سیاہ رنگ کے لباس میں ملبوس، چہرہ مفلر سے چھپائے ہوئے آیا اور سیدھا شبانہ بائی کے کوٹھے کے اندر چلا گیا۔سلو میاں اور

اس کے دوست نے اس کا پیچھا کیا۔۔امام صاحب اندر جا کر ایک سیڑھی سے اترا اور کوٹھے کی نچلی منزل میں جا کر بائیں طرف کے ایک کمرے میں گھس گیا۔۔۔۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں دوست کمرے کی کھڑکی سے جھانکنے لگے۔دونوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔سلومیاں نے اپنے دوست سے کہا۔۔ارے یہ تو شبانہ بائی کی بیٹی کو قرآن مجید پڑھا رہا ہے۔۔۔۔۔!!

...........●●● ....

☆......دیپک کنول

فیس بک

حاجی نورالدین رات کا کھانا کھانے کے بعد لان میں ٹہل رہا تھا تو تبھی وہ چکرا کے گر پڑا۔ اتفاق سے دونوں لڑکے اُس وقت گھر میں موجود تھے۔ اُنہوں نے وقت ضائع کئے بغیر باپ کو گاڑی میں ڈال دیا اور وہ اُسے لے کر اسپتال پہنچے۔ اُسے دل کا دورہ پڑ چکا تھا اسلئے اُسے ICU میں بھرتی کیا گیا۔ اُسکی حالت بہت نازک تھی۔ ڈاکٹر اُسے بچانے کے لئے جی جان سے کوشش کرتے رہے مگر اُن کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ گیارہ بج کے دس منٹ پر اُس نے آخری سانس لی۔ یہ خبر جیسے ہی اُس کے گھر میں پہنچی گھر میں کہرام مچ گیا۔ اسپتال کے سارے لوازمات پورے کرنے کے بعد رات کے بارہ بجے اُنہیں باپ کی لاش سونپی گئی اور وہ لاش لے کے گھر پہنچے۔

سب سے پہلے یہ فیصلہ کیا گیا کہ رشتے داروں کو اطلاع کی جائے۔ چونکہ رات بہت ہو چکی تھی اس لئے کسی کو اس وقت فون کرنا مناسب نہیں تھا اس لئے طے یہ پایا گیا کہ فیس بُک پر یہ خبر ڈال دی جائے کیونکہ آجکل تو یہی چلن تھا۔ صبح سب لوگ یہ خبر پڑلیں گے اور اگلے روز جنازے میں شامل ہو جائیں گے۔

اگلے روز دس بجے کے قریب میت روانہ ہوئی۔ بہت سارے رشتے دار پاس پڑوسی اور کاروباری ساتھی اس جنازے میں شامل ہوئے۔ گیارہ بجے کے قریب وہ لوگ قبرستان سے گھر لوٹے۔ گھر پہنچ کر جب اُنہیں پتا چلا کہ حاجی صاحب کی بہن

کے گھر سے اس جنازے میں کوئی شامل نہیں تھا تو دونوں بیٹوں کو دکھ بھی ہوا اور حیرت بھی۔ حاجی صاحب کی ایک ہی بہن تھی جو نہ خود اس دکھ کی گھڑی میں شامل ہوئی تھی اور نہ ہی اُس کے گھر سے کوئی پرسا دینے آیا تھا حالانکہ وہ بھی کشمیر کے سوپور قصبے میں رہتی تھی۔ پھوپھی کے یہاں فون لگایا گیا۔ وہاں سے جو روح فرسا خبر سننے کو ملی اُس نے سب لوگوں کو سکتے میں ڈال دیا۔ پھوپھی کا سات دن پہلے انتقال ہوا تھا اور یہ خبر اُنہوں نے اُسی رات فیس بُک پر ڈال دی تھی۔

............●●● ....

اندھ وشواس

میری پہلی ملاقات مونی بابا سے پہلگام میں ہوئی تھی جہاں اُس نے پہلگام کے قصبے سے دور لدر کے کنارے ایک کٹیا بنائی تھی جہاں وہ رمنی جلائے بیٹھا رہتا تھا۔ یہ جٹا دھاری سادھو جو ایک لنگوٹ پہن کے صبح سے رات تک اس رمنی کے پاس مستی کے عالم میں بیٹھا دکھائی دیتا تھا۔

پہلگام میں موسم ہمیشہ دگرگوں رہتا ہے۔ کبھی تڑاکے کی گرمی تو کبھی کڑاکے کی سردی۔ اُسے موسم کی اس متلون مزاجی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اُس نے اپنے شریر کو ایسے تپا کے رکھا تھا کہ اُس پر سردی گرمی کا کوا اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ بولتا نہیں تھا۔ اُس نے مون دھارن کیا تھا اس لئے اُس کا نام مونی بابا پڑ گیا تھا۔ اُس کی کٹیا میں صبح سے شام تک خاصی چہل پہل رہا کرتی تھی۔ یہاں اُس کے دو چار چیلے چانٹے ہر دم اُس کے ساتھ رہا کرتے تھے جو اُس کی کراماتوں کا بکھان کرتے رہتے تھے۔ اُس کے چرچے سن کر بہت سارے سیاح اُس کی کٹیا میں پہنچ جایا کرتے تھے اور اُس کے

درشن کرکے اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتے تھے۔اس کی کٹیا میں زیادہ تر بدیسی سیاح پڑے رہتے تھے جن میں زیادہ تر وہ بدیسی ہوا کرتے تھے جنہیں ہپی کہا جاتا ہے۔ یہاں اُنہیں چرس گانجا آسانی سے مل جایا کرتا تھا اور وہ چرس گانجے کے نشے میں بے سدھ پڑے رہتے تھے۔

مونی بابا ہمیشہ کسی اور دنیا میں کھویا رہتا تھا۔اُس کی خمار آلودہ آنکھوں سے جیسے شعلے دہکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔اُس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے کبھی بھی غائب ہوسکتا ہے۔لوگوں کا کہنا تھا کہ اُس کے پاس ایسی روحانی طاقت ہے کہ وہ ہوا کا جھونکا بن کر اُڑ سکتا ہے۔وہ بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہوسکتا ہے۔کچھ لوگوں کا یہاں تک کہنا تھا کہ وہ رات کو اندھیرے میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔کوئی اُسے پکڑ نہیں سکتا۔کوئی اُسے روک نہیں سکتا۔اُن کا ماننا تھا کہ وہ کوئی معمولی سادھو نہیں بلکہ وہ ایک پراسرار شخصیت تھی جسے سمجھنا آسان نہ تھا۔

جیسے ہی رات اپنے سیاہ گیسو پھیلاتی تھی اور پہلگام کا قصبہ نیند کی آغوش میں چلا جاتا تھا تو کٹیا کے گرد کئی سارے آلاو روشن ہوتے تھے اور پھر آلاو کی اس مدھم اور پر خمار روشنی میں اس کٹیا میں رقص وسرور کی محفل سجتی تھی۔مونی بابا گوپیوں کے سنگ ناچنے لگتا تھا۔ہر کوئی مستی میں ڈوبا رہتا تھا۔اس رت جگے میں مونی بابا غائب ہو جاتا تھا اور پو پھٹتے ہی وہ پھر سے نمودار ہو جاتا تھا۔اُسکے بھگت جن اسے بابا کے کرشمے سے تعبیر کرتے تھے۔

پھر ایک دن مونی بابا غائب ہو گیا۔اس بار وہ اکیلے نہیں بلکہ رینا نام کی ایک انگریزن بھی اُس کے ساتھ غائب ہوئی تھی۔

............●●● ....

شراپ

وہ کافی عرصے سے بیمار تھا۔ پہلے پہل تو وہ اسے سوکھی کھانسی سمجھتا رہا لیکن جب وہ منہ سے خون اُگلنے لگا تب اُسے احساس ہوا کہ یہ سوکھی کھانسی نہیں بلکہ تپ دق کی علامت ہے۔ جب وہ بڑی ہمت کر کے ڈاکٹر کے پاس چلا گیا تو اُس کا اندیشہ سچ نکلا۔ اُسے واقعی تپ دق ہو گئی تھی جس کے سبب وہ رات دن کھانستا رہتا تھا اور منہ سے خون اُگلتا رہتا تھا۔

بیٹا باپ کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتا تھا۔ وہ کھانے کی تھالی اُس کے دروازے کی چوکھٹ پر رکھ دیتا تھا اور وہ خود کام پر نکل جاتا تھا۔ ایک دن کیا ہوا کہ وہ دیر سے کام پر پہنچ گیا۔ جیسے ہی ٹھیکدار نے اُسے دیکھ لیا وہ اُس پر چڑھ بیٹھا۔ اُس کا مزاج بھی غصیل تھا۔ وہ زیادہ دیر تک اپنے غصے کو باندھ کے نہ رکھ سکا۔ جیسے ہی اُس نے منہ کھولا ٹھیکدار نے سیخ پا ہو کر نہ صرف اُس کو مارا پیٹا بلکہ اُسے دھکے مار کر دفتر سے نکلوا دیا۔ پہلی بار اُس کی اس قدر تذلیل ہوئی تھی۔ اُس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ بدلے کی آگ سے اندر ہی اندر جل رہا تھا۔

وہ جب گھر پہنچا تو اُس کے اندر کئی سارے جوالامکھی دہک رہے تھے۔ اُس کے اندر غصے اور انتقام کا اس قدر لاوا بھر گیا تھا کہ اگر یہ لاوا پھوٹ جاتا تو سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ سکتا تھا۔۔ باپ روٹی کی آس میں بیٹھا ہانپ رہا تھا جب کہ وہ اپنے زخموں کی ٹیک سے دہک رہا تھا۔ اُس کے اندر ایک عجب سی اُتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ اس اُتھل پتھل کو اُس کے باپ کی کھانسی اور زیادہ ہوا دے رہی تھی۔ باپ کھانس رہا تھا اور وہ جھنجھلا رہا تھا۔ اس کے بعد اُس کے سر پر خون سوار ہوا۔ وہ روز روز کی اس

مصیبت سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا جس نے اُس کا چین وسکون درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بھول گیا کہ جسے وہ مارنے جا رہا ہے وہ اُس کا بیمار اور لاچار باپ ہے۔ جیسے ہی اُس نے باپ کا گلا پکڑ کے دبانا چاہا اُسے لگا جیسے اُسے بجلی کا شاک لگا ہو۔ اُس کا باپ پہلے ہی مر چکا تھا۔ وہ ایک کمزور ڈال کی طرح ٹوٹ کے اُس کے قدموں میں جا کے گرا اور پھر دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اُسے لگا جیسے اُس کا باپ جاتے جاتے اُسے بہت بڑا شراپ دے کے چلا گیا ہو۔

............●●● ....

☆......مشتاق مہدی

عبادت

وہ کافی دیر سے مندر میں....

کرشن مہاراج کی مورتی کے سامنے سر جھکائے بیٹھا گیان دھیان میں مگن تھا۔اتنے میں کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔

''تمہارے جوتے....چرالئے گئے ہیں''

میرے جوتے...کل ہی جو میں نے خریدے تھے، چونک کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔پھر تیزی سے باہر نکل کر جوتے تلاشنے لگا۔

جوتے اپنی جگہ پر موجود پا کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔اپنے جوتے اٹھائے۔بغل میں دبائے اور پھر سے مندر میں آ کر عبادت کے لئے بیٹھ گیا۔

اب اُس کے سامنے کوئی مورتی نہ تھی۔

ذہن کے پردے پر دو جوتے چمک رہے تھے...!

............●●● ....

آخری دن

ایک محلے کے چار مکانوں میں چار بلب روشن ہیں۔یکا یک ہی ایک مکان کا بلب خاموش ہو جاتا ہے۔مکان تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔دوسرے مکانوں کے مکین جمع ہو جاتے ہیں۔بلب کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔بلب تو دیکھنے میں ویسا ہی

ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ تو پھر اِسے کیا ہو گیا۔

یہ اب پہلے کی طرح روشن کیوں نہیں۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہے ہیں.........ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں۔ اتنے میں دور سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آتا ہے۔ خاموش بلب کے آس پاس جمع لوگوں کو کسی قدر حیران سا دیکھ کر اپنی پہچان دیتا ہے۔

''میں پاور سٹیشن سے آ گیا ہوں۔ کہو کیا بات ہے ''

''یہ بلب تو کچھ دیر پہلے ہی روشن تھا...''

''اب یہ روشن نہیں ہوگا...کبھی روشن نہیں ہوگا۔ ''

''وہ کیوں جناب؟'' ایک آدمی پوچھتا ہے۔

پاور سٹیشن سے آیا ہوا شخص جواب دیتا ہے۔

''اس لئے کہ اس بلب کا کنکشن ہم نے ہی پاور سٹیشن سے کاٹ دیا ہے۔ اِس کے لئے ایک دن مقرر تھا۔ جو آج ہے۔ اِسے پھینک دو کسی کھائی میں..... یا پھر خاک میں چھپا دو۔ ٹھیک رہے گا۔''

کہہ کر وہ نکل جاتا ہے۔

آس پاس کھڑے مکینوں کے چہرے زرد پڑتے ہیں۔ سوچنے لگتے ہیں.....نہ معلوم ہمارے بلب کا آخری دن کون سا ہوگا.......؟

............●●● ....

وہ کون تھا

وہ ہنس رہا تھا...

اونچی آواز میں قہقہے لگا رہا تھا۔

پاگل دیوانے قہقہے.....

بلند بھیانک اور بے ہنگم قہقہے......اُسی سمندر میں جس میں تم رہتے ہو...جس میں...میں سانس لیتا ہوں۔

میں جونہی اس کی جانب بڑھا...مجھے لگا۔میری آہٹ سے وہ ڈر گیا۔ایسا محسوس ہوا...وہ اب سمندر کے پاتال میں جاکے چُھپ جانا چاہتا ہے کہیں۔

مگر کیوں..........؟

مزید سوچنے سے پہلے ہی میں نے آواز دی...

ٹھہر جاؤ....

وہ ٹھہر گیا۔میری نظریں اُس کے جسم پر رینگنے لگیں۔دوسرے ہی لمحے میں نے محسوس کیا۔وہ اندر ہی اندر تڑپ رہا ہے۔کانپ رہا ہے۔جیسے شیر کے پنجے میں کوئی معصوم خرگوش....

وہ آخر تھا کون........؟

انسان کا بچہ.....آدمی

نہیں...جھوٹ...وہ انسان نہیں تھا۔انسان کیا ایسے ہوتے ہیں۔

وہ کچھ اور تھا۔انسانی ہیولے کا ایک قہقہہ تھا.......ایک دھوکہ سا...ایک داغ بس اُس کے سر پر ایک بھی بال نہ تھا...... ماتھے پر کوئی لکیر نہ گوشت کی کوئی تہہ ہی باقی تھی۔

آنکھیں نہیں تھیں.........آنکھوں کی جگہ دو گہرے غار تھے۔ناک، .وہ کہاں تھی۔ نہ معلوم کب کس نے تیز کلہاڑی سے کاٹ دی تھی۔ہونٹ دانت ٹھوڑی کان...کندھا سینہ کمر پنڈلیاں... بازو ہاتھ پیر ٹانگیں..........یہ سارے اعضا اُس کے جسم پر تھے ہی نہیں اور اگر تھے تو کسی وہم کے مانند.....

اُس کے قہقہوں میں اب پہلے سے زیادہ تیزی اور تلخی آ گئی تھی۔اُس کی

آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ وہ آہستہ سے میری طرف بڑھنے لگا۔ اور اچانک ہی مجھ پر ایک خوف سا طاری ہو گیا۔ ڈر کے مارے میں کہیں بھاگنے ہی والا تھا کہ اُس کا قہقہہ اچانک آواز میں بدل گیا۔

''یہ....یہ میرا ہڈیوں کا کھوکھلا پنجرہ، یہ ایک تماشہ ہے اِس سمندر کا۔ جب کہ مجھ پر کوئی ہنستا نہیں ہے.......تو پھر یہ آواز، یہ ہنسی...جو میں روز سنتا ہے۔ کس کی ہے۔''

''جواب دو''

وہ اپنی پوری قوت سے چیخا۔''جواب دو میں کون ہوں ''

میں سوچنے لگا ۔۔۔!

............●●● ....

☆......زاہد مختار

تجربہ

باپ نے بیٹے کی اور دیکھا۔
بیٹا باپ کو پہلے سے ہی گھور رہا تھا۔
یہاں تجربہ کام آیا۔
باپ نے نظریں جھکا لیں ......!!

............●●● ....

شرپسند

''آپ کے حقوق دلوانا، میں اپنا اولین فرض سمجھتا ہوں''۔

وہ سٹیج پر شیر کی طرح گرج رہا تھا اور لوگ تالیاں بجا کر اس کی داد دے رہے تھے۔ فلک شگاف نعروں کا شور اور ہواؤں میں لہراتے ہوئے اس کی پارٹی کے جھنڈے، اس کے تابناک مستقبل کی غمازی کر رہے تھے کہ اچانک......

ایک قریبی گلی سے ایک عریاں شخص بچوں کی ایک بھاری فوج سے بچتا ہوا سٹیج کے سائے میں اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہجوم اس پاگل کی

مداخلت برداشت نہ کر سکے اور اسے سٹیج کے سائے سے گھسیٹ کر باہر نکال لائے۔

اب کچھ نوجوان اس کے پیچھے دوڑے گلی کے نکڑ تک......۔

چند لمحوں کے بعد......عریاں شخص اُس پارٹی کے جھنڈے سے اپنے عریاں خون آلودہ تن کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتا رہا اور مقرر کی آواز لاوڈ سپیکر پر پھر سے گونجنے لگی...

''لوگو......کبھی کبھار کوئی شر پسند عنصر میرا جلسہ بگاڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن میں......''

پاگل گلی کے نکڑ پر دم توڑ چکا تھا۔

............●●● ....

جشن

ایک بار سوئی اور دھاگے میں ٹھن گئی۔

نتیجہ چاکِ گریباں رفو نہ ہو سکا اور پیراہن شرم کے مارے مر گیا.!!

آج سوئی اور دھاگے میں دوستی ہے لیکن قبا کی حیا تار تار ہوتے ہوئے بھی جشن میں محو......!!۔

............●●● ....

☆......شیخ بشیر احمد

پرموشن

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اسکی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

سارا کمرہ برقی قمقموں سے منور تھا۔ دیوار پر پہلگام کے بہتے ہوئے نالہ لدر کی پینٹنگ، فرش پر کشمیری قالین، جس پر صوفے قرینے سے سجے ہوئے تھے اور کھڑکیوں پر رنگین پردے آویزاں۔

کمرے میں پھیلی ہوئی چینی سینٹ نتھنوں سے داخل ہوتے ہی اسے لگا جیسے وہ کسی انجانے سے عطار کی دکان میں داخل ہوئی ہو، سامنے انور صوفے پر بیٹھا ایک تازہ رسالے کے اوراق الٹ رہا تھا۔ اسکی ذہنی کیفیت بھانپتے ہوئے شاطرانہ لہجہ میں بولا۔

''آیئے، آیئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''

انور نے اس کا اچھے میزبان کی طرح خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور حریص نظروں سے سر سے پاؤں تک بھرپور جائزہ لے کر سامنے خالی صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

'' مجھے مسز شرما نے بھیجا ہے۔ یہ سن کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ جس کا اظہار وہ کھل کر نہ سکا۔

''ہاں۔ ہاں۔ وہ کل آپ کے شوہر کی پرموشن کی بات کررہی تھی اور آپ کے متعلق مجھے بتا چکی ہیں۔"

''جی ! مسز آصف ! آپ بخوبی واقف ہیں کہ اس وقت ملک میں نوکری کا ایک سنگین مسئلہ آن پڑا ہے اور اس صورتحال میں کسی کو ان ڈیو Un Due پرموشن دینا ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی میری یہ کوشش رہے گی کہ مسٹر آصف کو جلد ترقی ملے۔ اس کے لئے آپ کو..................!!

''جی ، میں سمجھتی ہوں، میں آپ کو ناامید نہیں کروں گی''۔

............●●● ....

نیا عجوبہ

اسے شہر کا نامور معروف فزیشن سمجھا جاتا تھا۔ یوں کلنک پر روز رش لگا رہتا تھا۔ شہر و دیہات کے مریض تانگے ،آٹو رکشا اور کاروں میں چلے آتے اور یہ یقین کر کے ایک نئی زندگی جینے کی آس لے کر جاتے۔

لیکن آج پہلی بار اچانک وہ پریشانی کے شکنجے میں آ کر ایک معمولی سی گھتی کو سلجھا نہیں پا رہا تھا اور نہ کوئی حتمی فیصلہ کر پا رہا تھا۔

سامنے میز پر تین پرچیاں پڑی تھیں۔ پہلی پرچی کے بعد جب دوسری پرچی کی رپورٹ دیکھی تو پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ ماتھے پر سلوٹیں مزید گہری ہوئیں۔ چند لمحوں تک وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان پرچیوں کو دیکھتا رہا۔

پہلی پرچی سرکاری اسپتال کے لیبارٹری کی یورین ٹیسٹ کی رپورٹ تھی۔ جسمیں تیزابی خاصیت کے ساتھ ساتھ Puss Cells بہت تھیں ساتھ ہی علامت شوگر کی تھوڑی سی مقدار بھی ظاہر کی گئی تھی۔

دوسری پرچی جو ایک نجی مقامی لیبارٹری میں کمپیوٹر پر تیار کردہ رپورٹ تھی۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ Puss Cells کی مقدار بالکل تھوڑی سی ہے۔ البتہ وافر مقدار میں شوگر دکھائی گئی تھی اور چار مہینے سے حاملہ بھی درج تھا۔

اس کا ذہین ماؤف ہوگیا۔ وہ اپنے کئے پر پشیمان اور نادم تھا۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کوس رہا تھا۔ کمیشن کے نام پر چند سکوں کے عوض وہ بک چکا تھا۔

تیسری پرچی تشخیصی نسخہ کی تھی، جس پر دوائی کے متعلق لکھنا باقی تھا۔

وہ کافی دیر تک مریض کے چہرے پر اتارو چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ چونکا دینے والی بات یہ تھی۔ سامنے سٹول پر کوئی مریض عورت نہیں۔ سینے اور دمہ کے امراض میں مبتلا ایک دبلا پتلا ضعیف ناتوان مرد تھا۔

............●●● ....

خیرات

کنڈیکٹر...... بس کے الگ الگ اسٹاپوں کا نام لیتا ہوا راہ گیروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ بس سواریوں سے کھچا کھچ بھر گئی پھر بھی کنڈیکٹر کو کوئی احساس نہیں تھا۔

اسی اثناء میں ایک بھکارن میری طرف ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

''بابو جی۔ خدا کے نام پر کچھ دو۔ وہ تیرا بھلا کرے گا۔''

''معاف کرنا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

'' کچھ تو دو۔ ایک روپیہ کا سوال ہے۔'' نجانے اس بار مجھے اسکی آنکھوں

میں بے پناہ مجبوری اور لاچاری دکھائی دی۔ساتھ ہی اس کی آواز بھی گلوگیر تھی، جو سننے والے کی رگ و پے میں سرائیت ہو جاتی تھی۔ مجھ سے بھکارن کی حالت دیکھی نہیں گئی۔ میلے پھٹے گندے کپڑوں میں جسم کا ایک ایک حصہ عریانیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں اتنا متاثر ہوا کہ پتلون کی جیب میں ہاتھ خود بخود چلا گیا۔اٹھنی کا سکہ ہاتھ آیا۔ میں نے گویا حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر بھکارن کے ہاتھ میں سکہ تھما دیا۔ پچاس پیسے کا سکہ دیکھ کر بھکارن بھڑک اٹھی۔اپنا منہ برا سا بنالیا اور واپس لوٹاتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں بولی.

''بابو جی۔آجکل اس کی ٹافی بھی نہیں ملتی۔لگتا ہے تم بھی اپنی طرح کا کوئی بندہ ہو۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے غصے میں بکنی سے ایک روپیہ نکال کر میری ہتھیلی پر رکھدیا۔

............●●● ....

☆۔۔۔۔زنفر کھوکھر

ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے

رات آٹھ بجے لوگوں کے یک بارگی موبائل اور فون دھڑا دھڑ بج اٹھے۔''ہیلو! ہیلو............''''جی فرمایئے!'' ''آپ اگر ٹی وی دیکھ رہے ہیں تو جلدی سے چینل بدلئے اور آج کل دیکھئے۔''

''مگر کیوں؟''''ایک خاص پروگرام چل رہا ہے۔سٹنگ آپریشن کا۔دیکھیئے تو سہی......!''

بس ہر کوئی اپنے اپنے اڑوس پڑوس میں اور اپنے جاننے والوں کو اسی طرح کی اطلاع بہم پہنچا رہا تھا۔

براڈ کاسٹر نے سٹنگ آپریشن کے ذریعے ایک مخصوص محکمہ کے کئی لوگوں کو رشوت لیتے ہوئے دکھانے کے بعد مذکورہ محکمہ کے ایک سنئیر آفیسر سے رابطہ کیا اور پوچھا۔

''سر، آپ نے ابھی ہمارا سٹنگ آپریشن دیکھا ہے۔اب آپ کیا کہیں گے۔''

مذکورہ محکمہ کے سینئر آفیسر نے کہا،''سب سے پہلے تو میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے ہمارے اِن کرپٹ لوگوں کو بے نقاب کیا۔چونکہ آپ کا یہ سٹنگ آپریشن اتنا واضح اور مکمل ہے کہ اب اس میں کسی نوٹس، کسی انکوائری یا کسی دیگر ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔میں نے ان لوگوں کے ابھی سے سسپینشن آرڈر جاری کر دیئے ہیں۔اب ان کے خلاف قانون کے مطابق سخت سے سخت کارروائی ہوگی۔''

سینئر آفیسر نے کہا'' ہمارے سینٹر آفس کے باہر لگے بورڈ پر فون نمبر موجود ہوتے ہیں۔انہی نمبرات میں سے کسی بھی نمبر پر فریادی فون کر کے اطلاع دے سکتا ہے۔''

براڈ کاسٹر نے کہا،'' سر آپ نے ہمیں اور ہمارے سننے والوں کو اچھی جانکاری دی۔شکریہ۔مگر ابھی آپ ہمارے ساتھ بنے رہیے۔ ابھی ہمارا سٹینگ آپریشن جاری ہے۔اور ناظرین، آپ بھی ہمارے ساتھ بنے رہئیے۔''

اب کہ ٹی وی سکرین پر رشوت لیتے ہوئے جو تصویر اُبھری وہ کسی اور کی نہیں تھی۔ بلکہ اسی سینئر آفیسر کی تھی جس نے ابھی ابھی اپنے محکمے کے کچھ کرپٹ لوگوں کے سسپنشن آرڈر جاری کئے تھے۔

............●●● ....

ریکارڈ

سکول میں آدھی چھٹی ہو چکی تھی۔بچے سکول کے احاطے میں کھیل کود رہے تھے۔کچھ پاس کے پارک میں ادھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔اسی بیچ ایک چپراسی ہراساں حالت میں باہر سے دوڑ کر آفس میں داخل ہوا اور سکول کے انچارج کے پاس جا کر کہا'' سر! باہر کوئی میڈیا والے اور ٹی وی چینل والے لوگ آئے ہیں۔وہ کیمرہ لگا کر بچوں سے پوچھ رہے ہیں کہ آپ کو سکول میں مڈ ڈے میل روزانہ ملتا ہے یا نہیں۔کچھ بچے کہہ رہے ہیں کہ نہیں ملتا ہے............۔

سکول کے انچارج نے برجستہ کہا'' کچھ نہیں ہوگا۔ہم نے اپنا ریکارڈ مکمل کر رکھا ہے۔''

............●●● ....

ناپ تول

''آؤ آؤ بہن! آؤ بیٹھو۔اور سناؤ، کیسے حال چال ہیں۔سنا ہے،اب تو آپ بہووالی بھی ہوگئی ہیں۔ذرا سناؤ تو کیسی ہے،آپ کی بہو؟''

''ارے بہن! مت پوچھو۔میں قد کاٹھی ناپتی رہی اور زبان کا خیال نہ رکھا!''

............●●● ....

☆......ڈاکٹر ریاض توحیدی

افسانچے کا جنازہ

''ارے یہ کیا... آپ نے تو ایک کتاب بھی لکھ ڈالی''۔

''کیوں... یہ کونسا مشکل کام ہے۔"

''مشکل کام۔۔۔؟ کل تک تو تمہیں افسانہ سمجھ بھی نہیں آتا تھا اور آج افسانچوں کی کتاب بھی لکھ ڈالی۔''

''چھوڑ یار۔۔۔کچھ بھی ہوسکتا ہے 'صرف انسان لکھنے بیٹھ جائے۔''

''مطلب...!''

مطلب یہ کہ چند دنوں سے فیس بک اور واٹس ایپ پر افسانچے دیکھتا رہا۔ پھر دیکھتے دیکھتے سوچا کہ جب اس طرح بے تکی باتوں اور مہمل جملوں کو ہی افسانچہ کہا جاتا ہے اور یہ لوگ تو ایک دوسرے کو ماہرین افسانچہ تک کہتے رہتے ہیں تو میں کیوں ہمیشہ قاری بن کر رہوں۔ پھر کیا چند دن تک موبائل کی اسکرین سے کھیلتا رہا اور افسانچوں کا ماہر بن گیا۔

یہ سنتے ہی میں حیران ہوکر اس کے چہرے کو تکتا رہا جس پر افسانچے کا جنازہ لکھا محسوس ہوا۔

............●●● ....

ہضم

سماج سدھار تنظیم کے اجلاس میں بحیثیت صدر وہ سماجی برائیوں پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے تقریر کر رہا تھا:

''ہر طرف بے ایمانی اور رشوت خوری کا دور دورہ ہے۔انسانیت کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ میں یہ سوچ کر غمگین ہو جاتا ہوں کہ آخر ہمارے سماج کا کیا بنے گا۔کب لوگ راحت کی سانس لیں گے اور جہیز جیسی ناسور بدعت کا خاتمہ ہوگا۔''

گھر آ کر وہ بڑے فخر سے گھر والوں کو اپنی تقریر اور لوگوں کی پسند کا ذکر کر رہا تھا اور سوشل میڈیا پر تقریب کی تصویریں دکھا رہا تھا کہ بیوی نے کہا:

''یہ سب تو ٹھیک ہے' بیٹے کی شادی کے بارے میں بھی کچھ سوچیں۔ایک اچھے خاندان کا رشتہ آ رہا ہے۔شہر میں فائیو اسٹار ہوٹل لڑکی کے نام ہے۔''

یہ سن کر اس نے مسکراتے ہوئے کھڑی سے باہر دیکھا۔

............●●● ....

مزدور کے خواب

''چل جلدی گاڑی صاف کر، آج ایک اہم پروگرام کی صدارت کرنا ہے۔''

شہر کے نامی گرامی سرکاری افسر نے ناشتہ کرنے کے بعد رامو سے کہا۔

رامو کئی برسوں سے سرکاری افسر کے ہاں کام کر رہا تھا۔اس نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گاڑی کو دھو کر چمکایا۔

افسر چمکتی گاڑی دیکھتے ہوئے خوش ہوکر بولا:

''آج ہمارے ساتھ تو بھی پروگرام میں چلے گا' کیونکہ مالکن بھی میرے ساتھ پروگرام میں جارہی ہے اور یہ مزدوروں کا ہی تو دن ہے۔ وہاں پرتم کو میرے ساتھ دیکھ کر لوگ بھی میری مزدور دوستی کی سراہنا کریں گے۔''

رامو یہ سن کر خوش ہوا کہ آج صاحب کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آرہے ہیں تو خوشی کے مارے ہاتھ جوڑے التجا کرنے لگا:

''جی مالک۔۔۔ کیا آج میرا کام ہوجائے گا......؟''

''کونسا کام۔۔۔؟ اچھا یاد آیا۔۔۔ بچی کی شادی کا، کس تاریخ کو ہے۔''

''مالک۔... بس تھوڑے بہت پیسوں کا انتظام ہو جائے، پھر تاریخ بھی طے۔۔۔"

''کتنی بار کہا تم سے کہا کہ کپڑے کا ایک جوڑا لا کے دوں گا لیکن تم لوگ بھی شاہی شادی کرنا چاہتے ہو۔''

''مالک۔۔صرف بیس ہزار میں کام ہوجائے گا۔''

''کیوں پروگرام میں جاتے وقت موڑ خراب کر رہے ہو۔صرف بیس ہزار سے کام چلے گا۔ادھر کیا پیسوں کی مشین لگی ہے۔ بڑے بڑے خواب دیکھنا بند کرو۔''

تقریب میں افسر کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔تقریر کے دوران اس نے پرجوش آواز میں کہا:

''مزدوروں کے خواب پورے کرنا ہمارا مشن ہونا چاہیے تا کہ مزدور طبقہ اگر کچھ زیادہ نہیں کم سے کم زندگی تو آرام سے گزار سکیں۔ یہی یوم مزدور منانے کا پیغام ہے۔ میں اپنے گھر کے نوکر رامو کو بھی ساتھ لایا ہوں کیونکہ یہ اصل میں انہیں لوگوں کا دن ہے۔''

شامیانہ تالیوں سے گونج اٹھا۔تقریر ختم کرنے کے بعد افسر کی طرف سے مزدور یونین کو بطور فنڈ پچاس ہزار روپے کا چیک پیش ہوا۔تقریب کے اختتام پر جب افسر کو غریبوں کا مسیحا کے ایوارڈ سے نوازا گیا تو راموبھی آبدیدہ ہو کر تالیوں کی جذباتی گڑگڑاہٹ کا حصہ بن گیا۔

...........●●● ....

☆......پرویز مانوس

روحی

ڈاکٹر نواز قد قامت آئینے کے آگے کھڑا ہو کر نکٹائی کا ناٹ باندھنے کو کوشش کر رہے تھے جب اُنہیں لگا کہ ناٹ اچھی طریقے سے بندھ گیا ہے تو اُنہوں نے کوٹ پہن کر ایک بار پھر آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا تو پیچھے سے ایک آواز اُس کے کانوں میں گونج گئی۔۔۔

''کیا کر رہے ہیں، ناٹ تو ٹھیک سے باندھئے اور پھر آئینے کے اندر سے دو ہاتھ نکل کر ناٹ کو درست کرنے لگے۔''

نواز صاحب پیشے سے ڈاکٹر تھے لیکن شاعری میں بھی اچھا خاصا نام بنا لیا تھا، دفتر کے لئے نکلنا ہو یا کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے ......ان کی شریک حیات روحی اُن کے پہناوے کا انتخاب خود کرتی۔ایک بار جب وہ کسی محفل میں جانے کے لئے تیار ہوئے تو بیگم سے اجازت لینے کے لئے کچن میں گئے تو روحی اُن پر برس پڑی......۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو......؟ ابھی سے بوڑھوں والے ڈریس پہننے لگے ہو؟'' یہ اور کوٹ کون پہنتا ہے؟ قمیض ایک رنگ کی، ٹائی ایک رنگ کی اور سوٹ دوسرے رنگ کا، یہ کیا کمبینیشن ہے؟ چلیئے چلیئے نکالئے واپس......''۔

ایک ہی سانس میں اُس نے سب کچھ کہہ دیا تو نواز صاحب نے کہا۔

''کبڈ میں مجھے جو سامنے ملا اُٹھا کر پہن لیا، ان کپڑوں میں کیا بُرائی ہے؟

ٹھیک تو ہیں......،،۔

''یہ لیجئے......!!

روحی نے کوٹ پتلون اور قمیض کبڈ سے نکال کر بیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

''پہن لیجئے......''

اُس کا چہرہ شرارت سے سُرخ ہو چکا تھا،نواز صاحب جانتے تھے کہ اس کی اس شرارت میں بھی محبت چھپی ہوئی ہے،ندامت سے بولے......۔

''ٹھیک ہے،ٹھیک ہے،بدل لیتا ہو،غصہ تھوک دو۔۔۔،،

''میں ابھی زندہ ہوں۔۔۔۔،مری نہیں،لوگ کیا کہیں گے کیسی عورت ہے ان کی،شوہر کو سنوارنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا''۔

وہ جل بھن کر بولی......۔

''آج تک تم نے ہی تو مجھے سجایا سنوارا ہے،تم سے بہتر سلیقہ مند کون ہوگا......یہ لو اب ٹھیک ہے؟

نواز صاحب نے تن کر روحی سے کہا۔

''ہاں آپ چالیس سال کے نوجوان لگ رہے ہیں''۔

''روحی ایک بات کہوں''۔

نواز نے جھک کر اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہے......؟

روحی نے منہ دوسری جانب پھیرتے ہوئے کہا۔

''تم نے مجھے پوری طرح ڈیپنڈنٹ بنا دیا ہے، جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو، مجھے اپنی چیزوں کے بارے کچھ بھی معلوم نہیں،سوچتا ہوں تمہارے بعد میرا کیا ہوگا، مجھے تو چائے کا ایک کپ بھی بنانا نہیں آتا، میں تو اپاہج ہو جاؤں گا۔

......اینی وے......،،۔

آئی لو یو کہہ کرنواز صاحب نے اس کا ماتھا چوما تو روحی روہانسی انداز میں بولی۔

'' آپ فکر مت کریں میرے مرنے کے بعد میری روح آپ کے سجنے سنورنے میں مدد کیا کرے گی......!روح......؟

ہاہاہاہا......!!تمہاری روح میری مدد کرے گی؟ نواز صاحب نے زور کا قہقہ لگا کر ناٹ درست کر رہے ہاتھوں کو چھونا چاہا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا......!!

............●●● ....

نیا گھر

وہ سب سے آگے تھا اور اس کے پیچھے پیچھے ایک بھیڑ چل رہی تھی، کچھ غمگین تھے اور کچھ مادیت کی باتوں میں مصروف خراماں خراماں چل رہے تھے، اُس کے تینوں بیٹے عرب امارات میں تھے اور دو بیٹیاں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ کینیڈا اور بحرین میں منتقل ہو چکی تھیں، اہلیہ بچاری تو ایک سال قبل کورونا مرض سے جاں بحق ہو گئی تھی جس کی قبر پر وہ مٹی بھی نہیں ڈال سکا تھا___ اُس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو اُس کی بلند وبالا عمارتیں، شاندار بنگلے، شاپنگ مال، بے شمار کاریں کروڑوں کی دولت، بے حساب اراضی سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا، دفعتاً اُسے جھٹکا سا لگا تو وہ سوچنے لگا یہ لوگ اتنا طویل سفر کر کے اُسے کس جانب لے جا رہے ہیں، اُس نے سوچا شاید اُسی مکان میں جو اُس نے گزشتہ دنوں مکمل کیا تھا، اُسے اندھیرے سے شدید

کوفت تھی اسی لئے اُس نے نئے مکان میں بے شمار جُھومر اور قُمقمے لگوائے تھے جس سے دیکھنے والوں کی آنکھیں چُندھیاں جاتیں، وہ خوش تھا کہ اُس کے بیٹے جدید طرز کی نئی تعمیر دیکھ کر بیحد خوش ہوں گے، پھر جب وہ نئے گھر میں داخل ہوا تو اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ یہاں پوری طرح گھٹا ٹوپ اندھیرے کا راج تھا، یہاں روشنی کیوں نہیں ہے وہ سوچ ہی رہا تھا کہ پھر اُسے محسوس ہوا اس پر منوں بار لاد دیا گیا ہو۔ اُس نے اُٹھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن کسی انجانی قوت نے اُسے دبوچ رکھا، اچانک اُس کے کانوں میں۔۔۔۔آ آ آ آ آ آمین کی زوردار آواز گونجی تو وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا، اچانک دو ماورا شکلیں اُس کے سامنے نمودار ہوئیں تو وہ اُن سے مخاطب ہوا۔

،، یہاں اندھیرا کیوں ہے؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ دونوں نے یک زبان ہوکر کہا،، یہی تمہارا "نیا گھر" ہے یہاں روشنی اعمال سے ہوتی ہے___،،

............●●● ....

ملبہ

وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے پانچ افرادِ خانہ کو لے کر خدا سے شکایت کر رہا تھا۔

''اے زمین و آسمان کے مالک کیا۔اپنی زمین پر تُو میرے لئے ایک آشیانہ میسر نہ کر سکا اور اس سنگ دل شخص کو اتنی بڑی حویلی نما مکان دے دیا جس نے کرایہ ادا نہ کرنے پر مجھ مفلس کا سامان اپنے مکان سے باہر پھینک دیا۔ میں بھی یہیں رہ کر دیکھتا ہوں کب تک تیری رحمت جوش میں نہیں آتی''۔

یہ کہہ کر وہ ٹھٹھرتی ٹھنڈ میں ایک دوسرے کے ساتھ چپک کر سڑک پر ہی سو

گئے ۔آدھی رات کواُس نے محسوس کیا کوئی ہولے ہولے اُسے ہلا رہا ہے۔اُس نے آنکھ کھول کر دیکھا تو چاروں طرف گھنا اندھیرا چھایا ہوا تھا،صرف دھڑام دھڑام کی آوازیں کانوں سے ٹکرا رہی تھیں اب اُسے معلوم ہوا کہ یہ زوردار زلزلہ تھا جو نیند میں ہی گُزر گیا......۔

دوسری صبح اس کے ساتھ والے خیمے میں اس کا مالک مکان اپنے مکان کے ملبے کوحسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھااور وہ آسمان کی طرف......!!''

............●●● ....

☆......راجہ یوسف

بٹوارا

''ماں میرے ساتھ رہے گی''

''نا ہی ۔ماں میرے ساتھ رہے گی''

''خبردار۔۔۔کوئی بھی میری ماں کو مجھ سے چھین نہیں سکتا۔۔۔ماں میرے ساتھ رہے گی''

پنچ میں بیٹھے مسجد اوقاف کمیٹی کے سارے ممبران حیران و پریشان تھے۔نہ کوئی ان کا فیصلہ مان رہا تھا اور نہ ہی وہ کسی نتیجے پر پہنچ رہے تھے۔شور شرابے کی وجہ سے پورا محلّہ جمع ہو چکا تھا۔

لڑائی تین بھائیوں کے بیچ تھی۔

لڑائی کی وجہ ماں تھی۔

ماں۔۔۔جو شوہر مرنے کے بعد پنشن خوار ہو گئی تھی۔

............●●● ....

توکل

میری ماں اکثر بازو میں درد کی شکایت کرتی رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اُسے کسی اچھے Orthopedic کو دکھادوں۔پر فضول میں پیسہ برباد کرنے کی وجہ

سے میں ہمیشہ فرصت نہ ہونے کا بہانہ بنا کر ٹالتا رہتا تھا۔

''یہ بھی کوئی بیماری ہے۔''

میں اسے ورزش کرنے کی ہدایت دیتا رہتا تھا۔۔۔ وہ کوشش تو کرتی تھی، لیکن اسے ورزش کرنے کا طریقہ نہیں آتا تھا جس پر میں جھنجھلا جاتا تھا۔ بار بار اسے ٹوکتا رہتا تھا۔۔۔ پھر کچھ میرے خوف سے اور کچھ اپنے توکل سے وہ چپ رہنے لگی۔ کبھی درد کی شکایت نہیں کی ۔۔۔

اب وہ صرف میری وجہ سے بہت زیادہ پریشان رہتی ہے اور بار بار مجھے ڈاکٹر کے پاس جانے پر مجبور کرتی ہے۔ کیونکہ جب سے میرے بائیں کندھے میں درد اٹھنا شروع ہوگیا ہے۔۔۔ میں رات بھر سو نہیں پاتا ہوں۔۔۔

............●●● ....

مدرس ڈے

آج مدرس ڈے تھا۔ جاوید نے ہوٹل سے وازوان کی ساری ڈشز منگوا لی تھیں۔ دونوں میاں بیوی اور بچوں نے مل کر چاول اور منگائی گئی وازوان ڈشز ڈائننگ ٹیبل پر سجا کر رکھ دیں۔ کمرے کی خوبصورتی بڑھانے کے لئے خاص خاص جگہوں پر مصنوعی پھول بھی لگا دیئے گئے اور سارے کمرے کو تیز روشنی سے نہلایا گیا تھا ۔ ویڈیو بنانے کے لئے تین اینگل سے تین موبائل فون سٹینڈز پر لگائے گئے تھے۔ پوری فیملی جاوید کی ماں کو سجائے گئے کمرے میں لیکر آ گئے ۔ اس کو بڑے پیار کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بٹھایا اور خود بھی اس کے دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔ سبوں کے

چہرے خوشی سے تمتمار ہے تھے۔ بس ایک ماں تھی جو حیران و پریشان ایک ایک کا چہرہ تک رہی تھی۔ جاوید کی بیوی واز وان پروس رہی تھی اور جاوید اپنے ہاتھوں سے رستہ، روگن جوش کاٹ کاٹ کر ماں کو کھلا رہا تھا۔ بیچ بیچ میں جاوید کی بیوی اور بچے بھی دادی کو لقمہ کھلاتے جاتے تھے۔ ویڈیو ایڈٹ ہو کر فیس بک پر ڈالی گئی تو دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں لائیکس اور کومنٹس آنے لگے۔ جاوید اس کی بیوی اور بچے ہاتھوں میں موبائل لئے خوش ہو رہے تھے۔ ایک ایک لائک پر تالیاں بجا رہے تھے اور فخر کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ڈائننگ ٹیبل صاف کرنے اور کچن میں برتن دھونے کے بعد جب ماں فارغ ہوئی تو وہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔ کچن کے ساتھ لگے چھوٹے سے اسٹور روم میں جب وہ لیٹ گئی تو اس کے کانوں میں فیملی کے چہکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جو فیس بک پر ویڈیو کی مبارکبادی وصول کر رہے تھے۔

............●●● ....

☆......رتن سنگھ کنول

چاچا

چاچا اکثر چُھٹی کے دن شہر سے گاؤں چلا آتا۔ اپنی جوان ہو رہی بھتیجی کے لئے اس کی من پسند کی بہت ساری چیزیں خرید کر لے آتا۔ بھائی، بھابی بہت خوش ہوتے۔ کبھی کبھی اپنے بچے بھی ساتھ ہوتے۔ اپنی بھتیجی کو پاس بُلاتا۔ اُس کو چومتا، گلے لگاتا، اور اپنے اُنس کا اظہار کرتا۔

پہلے کی طرح آج وہ پھر آیا۔ اس کے بھیا بھابی بہت خوش ہو لیکن بھتیجی اُداس ہوگئی اور چُھپ کر کہیں بیٹھ گئی

............●●● ....

حادثہ

اس کو گاڑی نہیں مل رہی تھی۔ ایک دوشیزہ نے اُسے اپنی سکوٹی پہ لفٹ دی۔ دوشیزہ حسین تھی۔ اُس کے خوبصورت ریشمی بال اُڑتے ہوئے آدمی کے چہرے پر لپک رہے تھے۔ گلابی کُرتی گدرا جسم پر پھب رہی تھی۔ آدمی پیچھے بیٹھا لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُس کی سوچ ٹھکانے نہ رہی۔ دوشیزہ اُسے چالو لگی۔ اس نے لڑکی سے پوچھا۔

''لڑکی! تو نے مجھے لفٹ دی، ڈر نہیں لگا؟''

'میں کسی مرد کو لفٹ نہیں دیتی لیکن آپ میں مجھے اپنا ابّو نظر آیا جو اسی سڑک پر پیدل چلتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا۔''

''بس رُک جاو!'' آدمی چلایا۔

............●●● ....

کتا

لڑکی کالج سے دیر سے لوٹی۔ رات کے سائے اتر آئے تھے۔ بس سے اترتے ہی گاؤں کے راستے پہ ہو لی۔ راستے کے دونوں اطراف مکی اور دھان کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئی جہاں عورتوں کے ساتھ کچھ حادثات پہلے بھی درپیش آ چکے تھے۔ سامنے سے ایک آدمی آ رہا تھا، لڑکی دیکھ کر گھبرا گئی۔ اُس نے کتابوں کا بیگ اپنے سینے سے چپکا لیا اور اُکھڑی ہوئی سانسوں سے قدم قدم آگے بڑھنے لگی۔ دفعتاً سامنے سے ایک کُتا بھی گاؤں سے آ گیا۔

کُتے نے لڑکی کو دیکھا اور کُتا رک گیا۔ اپنی لمبی سی تھوتھنی اوپر کو فضا میں لہرایا اور سونگھا۔ پھر واپس مُڑ کر لڑکی کے پیچھے پیچھے گاؤں کو جانے والی پگڈنڈی پہ چلنے لگا۔ لڑکی بھی اب بے خوف ہو کر کتے کے آگے آگے چلنے لگی۔

............●●● ....

☆......ناصر ضمیر

ریٹ لسٹ

''دست درازی پر پچاس ہزار''

''آبروریزی پر دو لاکھ روپئے''

''آبروریزی اور قتل ہونے پر پانچ لاکھ روپئے تک کا معاوضہ''

یہ ریٹ لسٹ اخبار میں دیکھ کر وہ جٹ سے اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ اُسے لگا جیسے اُسے بیچ چوراہے پر ننگا کر کے نیلام کیا جا رہا ہو۔

............●●● ....

آکال

......اور وہ گونگا ہو گیا۔

یہ خبر پھیلتے ہی سبھی دُکھی ہو گئے۔ کیا اپنے کیا پرائے سب نے افسوس جتایا۔ مگر کچھ لوگ اِس بات کو لیکر پریشان تھے کہ اچانک ایسا کیا ہوا جو وہ گونگا ہو گیا۔

خوش حال زندگی گذارنے والا شخص......

شاید کوئی صدمہ ہوا ہوگا......

یا پھر سر پر کوئی گہری چوٹ لگی ہوگی۔

پھر جب اِس بات کو اور زیادہ کریدا گیا تو اُس نے ایک کاغذ پر لکھ دیا۔

'' میں نے ہر شبد کو بول بول کر فنا کر ڈالا۔ اب میرے پاس کہنے کو کوئی شبد نہیں ہیں۔''

............●●● ....

معصوم سوال

شیدا اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔آنگن کا بڑا دروازہ کھلتے ہی اندر سے آواز آئی۔

کون ہے بیٹا۔

ماں......دادا جی آئے ہے۔

آئی ہائے، مصیبت کہو بیٹا۔

یہ بات سُنتے ہی معصوم شیدا سُن سا پڑھ گیا۔دادا جی ہولے ہولے چل رہے تھے اور شیدا اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر دادا جی کے ساتھ اندر چلا آیا اور دادا جی کو دم بھی نہ لینے دیا اور پوچھ بیٹھا دادا جی بوڑھے ہو کر آدمی کا نام کیوں بدل جاتا ہے۔دادا جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

نہیں نہیں بیٹا انسان کا نام مرنے کے بعد نہیں بدلتا لیکن تم ایسا کیوں پوچھ رہے ہو۔

معصوم شیدا نے جواباً کہا۔ممی ہمیشہ آپکو مصیبت مصیبت کہکر پکارتی ہے۔کبھی پتا جی یا دادا جی کہکر بُلاتی ہی نہیں...... یہ الفاظ سُن کر دادا جی پر تلخ حقیقت کا آسمان ٹوٹ پڑا ایسی حقیقت جس سے وہ کئی بار آنکھیں چُرا چکے تھے۔دادا جی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

............●●● ....

☆......ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

کمان

ایک ضعیف العمر شخص کہ جو زندگی کی نوے بہاریں دیکھ چکا تھا۔ برف کی مانند سفید بال، جھریوں بھرا چہرہ، ہاتھوں میں رعشہ اور کمر اس قدر خمیدہ تھی کہ دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بقچی پیٹھ پہ لیے جا رہا ہو۔ وہ دھیرے دھیرے سر جھکائے ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ تین نوجوان لڑکوں نے اسے دیکھا۔ وہ تینوں اس بوڑھے آدمی کی جھکی ہوئی کمر پہ ہنسنے لگے۔ ان میں سے ایک منچلے نوجوان نے اونچی آواز میں اس بوڑھے آدمی سے پوچھا۔

''دادا۔ آپ نے یہ کمان کتنے میں خریدی ہے؟''

اس بوڑھے آدمی نے آہستہ سے اپنے سر کو جنبش دی۔ لڑکے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ تینوں نوجوان بوڑھے کے قریب آ گئے۔ تب اس بوڑھے آدمی نے اس نوجوان کو جواب دیا۔

''بیٹا جب تم میری عمر کو پہنچو گے تو تمہیں یہ کمان مفت میں ملے گی''

............●●● ....

خطا کار

رحمت وارثی کا معمول تھا کہ وہ شام کو اپنے گھر اور گلی سے نکل کر بادامی چوک میں آ جاتے اور وہاں سے اپنے تین گہرے دوستوں، ندیم الحسن، برج موہن اور

سُندر سنگھ کے ساتھ دُور تک ٹہلنے چلے جاتے۔ اُن کے تینوں دوست تب تک ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک رحمت وارثی اُن کے پاس نہ پہنچتے۔ یہ چاروں یار ہر روز شام کو ٹہلنے کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ اپنے اپنے اہم گھریلو کام کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گھر سے ٹہلنے چلے آتے۔ ٹہلنے کے بعد یہ چاروں بادامی چوک پر آکر حلوائی کی دُکان پر چائے کا ایک ایک کپ پیتے اور اُس کے بعد ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہوئے رُخصت ہو جاتے۔

ایک روز حسبِ معمول رحمت وارثی کے تینوں دوست بادامی چوک میں اُن کا انتظار کر رہے تھے کہ کچھ ہی وقت کے بعد وہ اُن کے پاس پہنچ گئے۔ دوستوں نے باری باری رحمت وارثی سے ہاتھ ملانا چاہا تو اُنھوں نے دُور سے ہاتھ جوڑ لیے اور کہنے لگے:

''دوستو! اگر مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو تو معاف کیجیے۔ اب ہاتھ ملانے کا زمانہ نہیں رہا، بلکہ اب دُور سے ہاتھ جوڑ کر اپنی خطا کا اعتراف کرنے کا زمانہ آ گیا ہے کیونکہ خدا کی نظر میں ہر شخص خطا کار ہے۔ کوئی کم کوئی زیادہ۔ اس لیے آج کے بعد ٹہلنا چھوڑ دیجیے اور گوشۂ تنہائی اختیار کیجیے کیونکہ دُنیا میں کورونا وائرس آ گیا ہے!''

............●●● ....

سیکولرازم

طاہر صدیقی سیدھے سادے اور سچے کھرے آدمی ہیں۔ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنا انھیں نہیں آتا ہے۔ سنی سنائی باتوں کے بجائے وہ آنکھوں دیکھی چیزوں پہ زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ ایک روز جب وہ اپنے بچّوں کے اسٹیٹ سبجیکٹ بنوانے سے

متعلق اہم کاغذات لے کر تحصیل آفس میں پہنچے تو متعلقہ کلرکوں میں وہ جس کلرک کے پاس گئے وہ انگریزی لباس میں ملبوس، کلین شیو، گلے میں سونے کی چین، ایک ہاتھ کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی اور دوسرے ہاتھ کی انگلی میں پکھراج کی انگوٹھی تھی۔ طاہر صدیقی نے اس کلرک کی وضع قطع دیکھی اور کہا۔

''نمستے''

کلرک کے چہرے پہ خفگی کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے بڑے کرخت لہجے میں کہا

'' میرا نام محمد امین ہے''

طاہر صدیقی بولے'' مجھے معاف کیجئے۔ مجھ سے گستاخی ہوگئی'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے اسے اپنے کاغذات دکھائے اور دوسرے کلرک کی طرف قدم بڑھائے۔ دوسرا کلرک سفید ململ کا کرتا پاجامہ زیب تن کیے ہوئے تھا اور مٹھی بھر سیاہ ڈاڑھی اور لمبی زلفوں نے اسے خاصا پر کشش بنا دیا تھا۔ طاہر صدیقی نے اسے دیکھتے ہی کہا

''اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ''

کلرک کے ہونٹوں سے ہلکی سی مسکان ابھری اور پھر اس نے کہا۔

'' مجھے رام رتن کہتے ہیں'' طاہر صدیقی ششدر سے رہ گئے انھیں اپنا آپ اُس بلی کی مانند معلوم ہونے لگا جو کھسیانی ہونے کے بعد کھمبا نوچتی ہے۔

............●●● ....

☆......ڈاکٹر فیض قاضی آبادی

تدبیر

امجد کا ٹیسٹ پازیٹو آتے ہی سنگ آباد کو ریڈ زون قرار دے دیا گیا۔اس گاؤں کے تمام راستوں کو سیل کر کے لوگوں کو اپنے گھروں میں ہی محصور کر دیا گیا۔اشرف امجد کا دوست تھا اور اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ یہ مزدوری کر کے اپنے اہل وعیال کی کفالت کرتا تھا۔گھر میں جو کچھ موجود تھا وہ تین دن میں ہی ختم ہو گیا۔مقامی انتظامیہ نے بھی ابھی تک راشن کٹ تقسیم نہیں کیے تھے۔جب بھوک ستانے لگی تو بچے زور و قطار رونے لگے۔اشرف اور ان کی بیوی نے اپنے پیٹوں پر پتھر تو باندھ لیے لیکن بچوں کی بھوک ان سے برداشت نہ ہوسکی۔اپنے بچوں کو دیکھ کر وہ بھی زار وقطار رونے لگے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے۔اچانک اشرف کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گیے۔آدھ گھنٹے تک تین چار آدمیوں سے فون پر بات کرتے رہے۔ظہر کی اذان ہو رہی تھی،ایک ایمبولینس ان کے بوسیدہ مکان کے سامنے کھڑی ہوگئی اور ان سب کو کارنٹاین سینٹر پہنچادیا۔دوپہر کا کھانا پروسا جارہا تھا۔

............●●● ....

آدھے دن کی زندگی

پروفیسر فہد آج بہت خوش تھے کیوں کہ ان کی اہلیہ نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا تھا۔پچھلے چھ مہینے میں پہلی بار پروفیسر فہد کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کو

ملی۔وادیٔ مقدس میں ایک سال سے جاری جنگ میں پروفیسر فہد نے اپنے خاندان کے لوگوں کو اپنے سامنے مرتے دیکھا ہے۔ بوڑھے والدین اور تین لخت جگر صرف چھ مہینے پہلے پروفیسر فہد کو اس وقت داغ مفارقت دے گئے جب ان کے شہر کو ائیر اسٹرایک سے ویراں کیا گیا۔اس وقت یہ میاں بیوی معجزاتی طور پر بچ گئے تھے۔

صبح پانچ بجے اس نومولود نے جہان رنگ و بو میں آنکھ کھولی۔زچہ کی نارمل ڈلیوری ہوئی تھی۔زچہ بچہ دونوں صحت مند تھے۔اس خوب صورت بچے کی آمد پر ہوسٹل کے سارے بچے اور عورتیں خوشی سے جھوم رہے تھے۔ اچانک دوپہر پانچ بجے صیہونیوں نے آج پھر ائیر اسٹرائک شروع کی۔اس دفعہ اس ہوسٹل کو۔۔۔

............●●● ....

خشک سالی

پہلے سال پروفیسر صاحب نے اکرم کو اپنے پرچے میں نوے فیصد مارکس دئے۔اس سال اکرم نے کشمیر سے اخروٹ، بادام،سیب،زعفران وغیرہ سب چیزیں ساتھ لے کر امتحان سے پہلے ہی پروفیسر صاحب کو دئے تھے۔دوسرے سال کے امتحان کا جب رزلٹ نکل آیا تو اکرم صرف چالیس فیصد مارکس سے پاس ہو گئے تھے۔اس سال کشمیر خشک سالی کی شکار ہوگئی تھا۔

............●●● ....

☆......شفیع احمد

ممتا

تین روز پیہم بارشوں کے سبب ندی نالوں میں پانی بھر گیا تھا۔چارسوسیلابی پانی گھس آنے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔سرکار نے اپنے کارندوں کو خاص ہدایت دی تھی کہ صورتحال پر کڑی نظر رکھی جائے اور حفاظتی باندھوں پر نگرانی بڑھائی جائے۔ کارندے بھی کہیں ریت، کہیں مٹی اور کہیں پتھر وغیرہ سے ٹوٹے ہوئے پشتے مضبوط کرنے میں لگے تھے۔ریڈیو اور ٹی وی پر مسلسل ہدایات جاری ہورہی تھیں کہ بچاؤ کے طور طریقوں پر کیسے عمل کیا جائے۔بعض لوگ ان ہدایات کو غور سے سن کر انہیں عملانے کی بھی کوشش کر رہے تھے تاہم کچھ لوگ ان پر طنز کرتے اور سرکار کو دشنام طرازی کا شکار بناتے۔

ہمارے محلے کو بھی سیلابی صورتحال کا خدشہ تھا اسلئے محلّہ کمیٹی کے صدر نے ہر گھر سے کم از کم ایک فرد کو ندی کے پشتوں پر متواتر نظر رکھنے کی ہدایات جاری کردیں۔محلے کے ڈیوٹی پر تعینات افراد ٹولیوں میں بٹ کر نگرانی کر رہے تھے۔ایک دکان کے ٹھڑے پر ہماری ٹولی نے مورچہ سنبھالا تھا اور اسکے اوپر بنے چھت کے سبب ہم بارش سے بھیگنے سے بچے رہے۔سردی سے بچنے کے لئے ہم نے میوہ پیٹیوں کی پتلی لکڑیوں سے الاؤ جلایا تھا۔شاید اس نے ہمارے جلائے الاؤ کو بھانپ لیا تھا کہ وہ بھی بارش سے بھیگنے سے راحت پانے کے لئے ہمارے قریب آگئی۔لیکن کچھ دیر ہمارے درمیان گزارنے کے بعد چل پڑی۔نہ وہ کچھ سمجھ یا کہہ سکی نہ ہی ہم میں سے

کوئی اسکے ذہن کو پڑھ سکا۔ایک طائرانہ نظر ڈال کر وہ چل دی شاید یہ سوچتے ہوئے کہ محلے کے ذمہ دار ہوتے ہوئے بھی میری ایک بات سمجھ نہ سکے۔

اس دوران ایک جگہ ہلکا سا چھید ہوکر پانی رسنے لگا۔ہماری ٹولی اچانک خبردار ہوگئی اور ہم سرعت کے ساتھ پانی روکنے میں جُٹ گئے۔کہیں سے مٹی کا انتظام کرکے رِساؤ کی جگہ کی مرمت کی اور مزید بہاؤ کو روک دیا۔ہم بات چیت، گرمی کرنے اور مذاق لوٹنے میں مشغول ہوگئے کہ وہ پھر سے آتی دکھائی دی۔ایک بار پھر طائرانہ نظر ڈال کر واپس ہولی تو محلّہ صدر نے ہم دولوگوں پر ذمہ داری ڈال دی کہ ہم اس کا پیچھا کرکے پتہ کریں کہ وہ یہاں سے نکل کر کہاں جاتی ہے۔حکم کے مطابق ہم اس کے پیچھے ہو لئے۔کچھ دور چل کر وہ ایک تنگ جگہ پر پانی میں تیر کر ندی پار کر گئی ۔ہم نے بھی اسی کی تقلید کی۔ایک جگہ رک کر ہمیں اسکے چار پلے نظر آئے جو سردی اور بارش کے سبب ٹھٹھر رہے تھے۔ہم نے پالتھین سے ہاتھوں کو ڈھک لیا اور اسکے دو دو پلے اٹھا کر واپس چل دئے۔اَلاؤ کے آس پاس رکھنے سے ان میں جان آ گئی اور وہ اپنا منہ ہمارے پیروں کے قریب رکھکر شاید شکریہ ادا کرتی رہی۔

............●●● ....

سکتہ

کیا۔۔۔۔۔۔اشرف۔۔۔۔۔شیدے کا اشرف!

عورتیں بین کرتی اور سینہ کوبی کرتے ہوئے ان کے منہ سے اشرف اشرف کا نام پکارا جاتا۔شیدے کا جوان سال اشرف اچانک موت کی آغوش میں چلا گیا تھا اور یہ خبر گاؤں میں پہنچتے ہی لوگوں پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔نزدیکی پڑوسی ہی نہیں بلکہ پورے گاؤں میں مانو بجلی گر گئی تھی۔

شیدہ کوئی چالیس سال کا تھا، یومیہ مزدوری کرتا تھا۔اصل نام رشید تھا لیکن غریب لوگوں کی معاشی زندگی کے ساتھ نام بھی بگڑ جاتا ہے، ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ ہوا کہ شیدہ کے مخفف سے پہچانا جانے لگا۔محنت مزدوری کرکے بال بچوں کا پیٹ پالتا ۔رہن سہن دو یک منزلہ کمروں میں ہوتا جن کے اندر ہی کھانا پکانا، بود و باش اور بچوں کی پڑھائی لکھائی جاری تھی۔اسے بچوں کو پڑھانے کا سخت شوق تھا، قسمت اچھی تھی کہ بیٹا اشرف ہونہار اور محنتی نکلا۔خود پڑھتا اور دوسرے بچوں کو بھی پڑھاتا۔کچھ رقم مل جانے سے اپنی کتابیں، فیس وغیرہ کا بوجھ شیدے پر نہ ڈالتا بلکہ اپنی چھوٹی بہن کی بھی تعلیم میں مدد کرتا۔

لیکن آج شیدے کے سر پر بجلی گری جب اسکا جوان سال بیٹا اچانک موت کا نوالہ بنا۔جب گاڑی میں میت گھر پہنچی ماں بہن نے بال نوچے، رو رو کر حال برا کیا بلکہ اگر بشیر حاجی نے لپک کر اسکی بہن کو پکڑ نہ لیا ہوتا وہ تو سر پتھروں کے ڈھیر پر مارنے لگی تھی۔

بشیر حاجی علاقے میں جانا پہچانا نام تھا، آسودہ حال اور غریب پرور۔اشرف کی موت کی خبر سنتے ہی گاڑی کا انتظام کیا اور لاش لیکر گاؤں پہنچا۔تدفین کے کام میں پہل کی ۔چار دن سوگ چلا اور اسکے بعد رسم چہارم ہوئی۔تعزیت کرنے والوں کو چائے پلائی گئی، تلاوت کرنے والوں کو بھر پور کھانا کھلایا گیا، باقی رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو بھی حسب مقدور کھانا پروسا گیا۔

مرنے والوں کے ساتھ کون مرا ہے ۔دو ہفتے گزرنے کے بعد شیدے کو مشورہ دیا گیا کہ کام پر نکلے، کچھ تو جی بھی بہل جائے گا اور آجکل کے مشکل اور گراں بازاری کے دور میں کچھ آمدنی ہوگی تو گھر بار کا گزارہ چلے گا۔شیدے نے بیوی کے ساتھ مشورہ کرکے یہ فیصلہ لیا کہ کام پر نکلنے سے پہلے بشیر حاجی کے ہاں جاکر شکریہ ادا کیا جائے۔صبح سویرے حاجی کے گھر پہنچ گیا۔حاجی نے خوشی خوشی استقبال کیا۔چائے پلائی۔

''شیدے سویرے سویرے کیسے آنا ہوا؟''

''حاجی صاحب میں آج سے کام پر نکل رہا ہوں، سوچا پہلے آپ کا شکریہ ادا کروں''۔

''شکریہ کس بات کا؟''

''اشرف کی موت کے وقت آپ نے اتنی تکلیف اٹھائی''۔

''وہ تو میرا فرض تھا۔لیکن کہتے ہیں حساب کتاب میں انسان کو ایمانداری سے کام لینا چاہیئے۔" حاجی نے کاغذ کے کچھ ورق سامنے رکھے۔

گاڑی کا کرایہ چار ہزار، ٹینٹ اڑھائی ہزار، کھانا وغیرہ، چائے کا خرچہ اور باقی......متفرق۔

کل میزان کالم پر نظر پڑتے ہی شیدے کے بدن میں جھرجھری پھیلی، پسینے سے شرابور ہوگیا اور اس پر سکتہ طاری ہوگیا!

............●●● ....

تیسرا دن

دوپہر ہوتے ہوتے مکانوں کی پہلی منزلوں کی کھڑکیاں برف میں چھُپ گئیں۔اسکے بعد غیر معمولی صورتحال پیش آئی۔ برفانی تودے گرنا شروع ہوگئے جو پہاڑ کے دامن تک پہنچتے پہنچتے وسیع ہوجاتے اور اپنے اندر پیڑ اور یک منزلہ مکان سمو لیتے۔

برف سونامی!

لگاتار برف باری اور تودے گرنے کے سبب علاقے میں افراتفری پھیل گئی۔ چیخ و پکار اور مدد کی درخواستیں فضا میں گونج رہی تھیں، والدین بچوں کو پکار رہے تھے، بھائی بہن ایک دوسرے سے مدد مانگ رہے تھے۔ سارا منظر دل دہلا دینے والا تھا۔

وہ تینوں دوست ہاتھ ہلا ہلا کر ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے اور پھر

وہ موت کے منہ سے واپسی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بچتے بچاتے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے وہ پہاڑی کے محفوظ حصے میں پہنچ گئے جسکے اوپر بڑی چٹان کے سبب غار جیسی بنی تھی جس کے اندر سونامی سے بچنے کا قدرتی انتظام موجود تھا۔

لیکن جہاں قدرت نے بچاؤ کا ایک طریقہ فراہم کیا وہیں ایک دوست کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ بخار کے سبب اس کا بدن جلنے لگا اور ساتھ ہی اسکے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ مدد کا کوئی طریقہ نہیں سوجھا لیکن پاؤں پر ہاتھوں سے رگڑ کے ذریعے افاقہ کرنے کی سعی جاری رکھی۔ دیر گئے تک حالت بگڑتی ہی گئی اور آخر کار وہ موت کا مزہ چکھ ہی گیا۔ دونوں دوست دہاڑیں مار مار کر روئے لیکن موت سے کس کو راستگاری ہے۔ باہر حالت ایسی تھی کہ دفن کا کوئی انتظام ناممکن تھا۔

پہلے دن رونے دھونے کے سوا کچھ نہ کر پائے۔ دوسرے دن کھانے کے لئے جو جلدی میں روکھی سوکھی روٹیاں ہاتھ لگی تھیں ان کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ گیا۔ بچپن کے دوست کی لاش سامنے پڑی تھی بس دوستی کے وہ قصے یاد آتے رہے۔ پھر ایک اور مصیبت نے آگھیرا کہیں سے غار کے اندر پانی رِس کر آنے لگا۔ کوشش کی کہ لاش کو پانی نہ چھو پائے اسلئے ایک محفوظ جگہ بنا ڈالی۔

تیسرے دن ایک طرف رستے پانی نے جینے نہ دیا اور دوسری جانب پیٹ کی آگ نے سر اٹھالیا۔ کچھ دیر دونوں بلاؤں سے جھوجھتے رہے پھر ہمت ہارنے لگے۔ آنکھ کے اشارے سے کام لیا۔ لاش کو پیٹ کے بل لٹا دیا، اوپر ایک چادر ڈال دی۔ رِستے پانی سے بچاؤ کا یہی ایک راستہ نکل آیا اور اس کے اوپر بیٹھ گئے۔

پوٹلی سے کچھ روٹیاں اور اچار کے ٹکڑے نکال کر بیچ میں رکھ دئے۔ اور دنیا کی سب سے بڑی مصیبت بھوک کا مقابلہ کرنے لگے!

............●●● ....

☆......طارق شبنم

فیس

''یہ لو بیٹا تمہارے سکول کی فیس چھ سو روپے اور ٹیوشن سنٹر کی فیس پانچ سو روپے''۔

''اور پاپا وہ درسگاہ کے لئے بیس روپے''۔

''کس لئے؟''

''پاپا...مولوی صاحب کہتے تھے کہ فرش نیا لانا ہے''۔

''حد ہوگئی، یہ مولوی صاحب ہر مہینے کسی نہ کسی بہانے دس بیس روپے اینٹ لیتا ہے''۔

اس نے ناگواری سے کہا۔

............●●●............

ماں

وہ حسب معمول شام کا کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔گلزار نے دروازہ کھولا تو باہر کچھ فوجی تھے۔جنہوں نے سرسری طور گھر کی تلاشی لینے کے بعد گاؤ خانے کا رخ کیا اور وہاں سے میووں سے بھرا لفافہ برآمد کر کے گلزار سے پوچھا۔

''یہ میوہ یہاں کس کے لئے چھپا رکھا ہے؟''

گلزار کے کانوں کی لوئیں سرخ ہوگئیں اور کوئی جواب نہیں بن پایا تو ایک فوجی نے دوچار مکے اس کو رسید کئے۔ پاس ہی کھڑی بڑھیا، جس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گلزار نے یہ میوہ اپنی بیوی کے لئے چھپا رکھا ہے، پھرتی سے فوجی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ندامت سے بولی۔

''اسے مت ماریئے۔ یہ میوہ اس نے اپنی بیوی سے چھپا کر میرے لئے رکھا ہے۔''

''تم کون ہو؟''

''میں اس کی ماں ہوں۔''

...........●●● ....

آواگون

ساری رات کھلی آنکھوں اضطراب و پریشانی میں گزار کر پو پھٹتے ہی وہ اپنے بیٹے کی تلاش میں نکلا تو گھر سے باہر قدم رکھتے ہی اس کی نظر اپنے لاڈلے پر پڑی جو اپنے دوستوں کے ساتھ گھر کی طرف آرہا تھا۔اس کی جان میں جان آ گئی ،وہ اُلٹے پاؤں واپس گھر میں داخل ہوا اور یہ خوش خبری اپنی بیوی کو سنائی جو بیٹے کے غم میں نڈھال ہو چکی تھی۔اس کے دوست جب چائے وغیرہ نوش کر کے واپس چلے گئے تو اس نے بیٹے سے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کہاں تھا تو رات بھر؟......ہماری نیند حرام کر دی''۔

باپ کی بات کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا اور نہ ہی اس نے اس کی بات کا کوئی

جواب دیا۔

''میں کہتا ہوں اپنی آوارہ حرکتوں سے باز آجا ورنہ......''

''ورنہ کیا کرلے گا......''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بیٹا گرجا اور غصے سے لال ہوکر اپنی مٹھّیاں بھینچتے ہوئے دروازے پر زوردار گھونسہ رسید کرتے ہوئے باہر چلا گیا۔ وہ اور اس کی بیوی بے بسی سے ایک دوسرے کا منہُ تکتے رہے......شام کو دونوں اپنی نافرمان اولاد کی شکایت لے کر محلے کے بزرگ پیر صاحب کے پاس پہنچ گئے اور رو رو کر اسے اپنا دکھڑا سنا کر دعا کی استدعا کی۔

پیر صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور قلم دان سے قلم نکال کر لکیریں مارتے ہوئے گویا ہوا۔

''تیری جوانی میں تیرے والدین بھی ایسی ہی شکایتیں لے کر میرے پاس آتے تھے......''

............●●● ....

☆......ڈاکٹر رافعہ ولی

برگ

''شاخ سے ٹوٹا ہوا برگ ہوں''۔

وہ اکثر اپنے آپ کو ایسے ہی قنوطی طریقے سے ظاہر کرتا اور میں اسے کہتی تھی۔

''جہاں برگ گر گیا، رل گیا، مٹ گیا، چر چرا گیا''۔

لیکن نہ جانے وہ کیوں نہیں مان رہا تھا۔ پچھلے پچیس سالوں سے وہ اپنے ملک سے باہر تھا۔ وہ نام بدل کر گیا تھا، مگر اپنا اندرون نہیں۔ پچیس سال پہلے جب وہ حالات کے ہتھے چڑھا تھا تو یاروں اور رشتہ داروں نے مل کر سمجھایا کہ شاہد ہجرت کر ورنہ بار بار زنداں کی کال کوٹھری کے نذر ہو جائے گا۔ آخر کار وہ شاہد سے ظفر ہو گیا اور ملک سے باہر چلا گیا۔ کڑی محنت ومشقت کرنے کے بعد کام جما۔ گھر میں سب کا مان بن گیا، پر جیسے ہی وہ گھر آنے کی بات کرتا ہر کوئی اسے ٹال دیتا۔ کیونکہ اس عرصے کے دوران کئی نشیب وفراز گزر چکے تھے۔ لیکن وہ بضد تھا اور شاہد بن کے آیا۔ افسوس وہ شاخ سے گر کر رل گیا، مٹ گیا چر مرا گیا۔

............●●● ....

رقص

ثاقب اس مور کی طرح تھا جو رقص کرتے کرتے محو ہو جاتا ہے لیکن جب

اس کی نظر اپنے پاوں پر پڑتی تو اس کا سارا رنگ بھک سے اڑ جاتا اور پھر مور دوبارہ اپنے سندر پروں سے بھدے پیروں کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش میں مادہ کو رجھانے کی کوشش کرتا۔ ثاقب صاحب سے بہت پہلے ایک ادبی نشست میں ملاقات ہوئی تھی۔ باوقار شخصیت، سرخی مائل گورا رنگ، ناک پر پسینے کے قطرے چمکتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا کہ بس ابھی ڈھلک کر موتیوں میں بدل جائیں گے۔ وہ تمام ادبی حلقوں میں احباب اور اقربا کے یہاں ایک شریف النفس انسان کے طور پر جانے جاتے اور میرے لئے تو تھے ہی۔ کئی سالوں تک ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے یہ احساس ہوا کہ نہ جانے کیوں جب بھی وہ مخالف جنس کو دیکھتے تو ان کی پتلیاں عجیب طرح سے ناگ کی طرح بل کھانے لگتی شاید اکثر و بیشتر مردوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہو۔ مگر جو تشنگی کا احساس کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں اتر آتا وہ نظروں کے باوجود اگر گرفت میں آجاتی تو وہ سالم ہی نگل جاتے اور کچھ ہی دیر بعد وہ سادہ، مہذب اور بے ضرر انسان محسوس ہوتے۔

میں اکثر ان سے کہتی بھی تھی بھابی کو بھی لے آئے نا۔ اپنے احباب سے ملانے کیونکہ اپنی کامیابی کا سارا کریڈٹ وہ اپنی بیگم کو ہی دیتے۔ لیکن وہ بڑی حلاوت سے کہتے ارے نہیں وہ ایک گھریلو خاتون ہے۔ اس کا باہر کی دنیا سے کیا لینا دینا۔ بیچ میں ان سے ملنے ملانے کا سلسلہ رُک گیا۔ وہ ایک کامیاب فکشن نگار تھے۔ ان کی کمی مجھے بہت کھلتی تھی۔ ایک دن میں اپنے بچے کو لیکر ان کے دئے گئے پتے پر پہنچ گئی۔ دروازہ ان کی بیگم نے کھولا تھا۔ میں نے اس خوبصورت وجود پر نظر دوڑائی، وہ چاند جیسی ہی تھی بس ہلکا سا داغ اُن کے حسن کو مات دے رہا تھا اور ثاقب صاحب کی حالت اسی مور کی طرح تھی جو سارے رنگ بھول کر صرف بدھے پن کو دیکھتا ہے۔

............●●● ....

آواز

پورے رستے میں امجد کی پل میں تولہ اور پل میں ماشہ والی فطرت پر غور کرتی رہی۔لیکن کہیں کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ میں ان کی تحریروں سے متاثر نہیں تھی لیکن ان کے بار بار کے اصرار پر ان کی تازہ کتاب لینے ان سے ملنے جا رہی تھی۔ وہ اکثر سماج کے دو رخے چہروں کو بے نقاب کرتے۔ یہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس موضوع کو اگر ان کی تحریروں سے نکال دیا جائے تو باقی صرف سیاہی رہ جاتی۔ ان کے دورخی کرداروں میں کبھی نفسیاتی پہلوں پر بات نہیں ہوتی تھی، اس لئے وہ منصف بھی خود ہی تھے اور ملزم تو باقی سب تھے ہی، وہ چاہے مسجد کا امام ہو یا مندر کا پجاری۔ ڈاکٹر ، ماسٹر، ساہوکار، صنعت کار کسی کو جو انہوں نے بخشا ہو یہ سب سوچتے ہوئے میں ان کے دروازے تک پہنچ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ اندر داخل ہوئی تو ایک چھوٹی سی معصوم بچی کو یخ بستہ موسم میں ننگے پیر پوچھا لگاتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ مجھے کپکپاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

میں ڈھیٹ بن کر بیٹھ گئی تو سامنے ان کی بیگم نیم مردہ بستر پر دراز تھی۔ میں نے بے شرم ہو کر یہی سے کہہ دیا۔ سر چائے کی طلب ہو رہی ہے، سردی بہت ہو رہی ہے نا۔ وہ خود کچن کی طرف چلے گئی جہاں برتنوں کے ساتھ ساتھ ان کی آواز کبھی چیخ رہی تھی کبھی تو دب کر کبھی چیخ کر۔اور کچھ ہی دیر میں مدبر اور نباض لکھاری کی آواز اپنے قلم کی روانی پر رس گھول رہی تھی مگر میری سماعت میں برتن ابھی بھی چیخ رہے تھے۔

............●●● ....

☆......جنید جاذبؔ

تو یہ تم ہو!

''بھائی تو اس آفت کا مارا تھا ہی اب بہن کو بھی چسکا لگ گیا ہے......خدا ہی کوئی ہدایت دے ان نامعقولوں کو''۔

نالاں نالاں سی یہ آواز رسوئی سے آئی تھی۔

''دیکھو تو......کیسے پتھر بنے بیٹھے ہیں۔مجال ہے جو آپس میں بھی کوئی بات کر لیں''۔

رسوئی سے ملحق لِونگ ایریا سے فوراً تائیدی ردِعمل آیا۔

کمرے میں، تقریباً آمنے سامنے بیٹھ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے لاتعلق آن لائن چیٹنگ میں یوں منہمک تھے جیسے آس پاس اور کوئی موجود نہ ہو۔

معروف کی دوستی نفیسہ نامی لڑکی سے تھی جب کہ عافیہ کسی ساحل سے پینگیں بڑھا رہی تھی۔ بات آگے بڑھی تو اپنا اپنا ایڈریس ایکسچینج کیا گیا، مشغولیت بارے باتیں ہوئیں اور پسند ناپسند کا ذکر چھڑا۔ساحل کے ایڈرس میں اپنے ہی شہر کا نام دیکھ کر عافیہ کو ایک جھٹکا سا لگا، کیوں کہ ایسے تعلقات میں شہر بھر کی دوری کو بوجوہ ترجیح دی جاتی ہے،لیکن پھر اپنا اور اپنے شہر کا صحیح نام بتانے سے گریز کرتے ہوئے اس نے چیٹ جاری رکھی ۔فرضی ناموں کے استعمال میں بہر حال یہ فائدہ رہتا ہے کہ ایک دوسرے پر کتنا بھی کھُل ڈُل جاؤ ایک دفاعی پردہ اور محفوظ فاصلہ بہر حال بنا رہتا ہے اور کل کلاں معاملہ بگڑ بھی جائے تو بات گھر اور گلی محلے تک نہیں پہنچتی۔

ڈِسکشن کچھ کچھ' نان ویج' رنگ پکڑنے لگا تو عافیہ انگڑائی لیتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ ایک نظر بھائی کی طرف دیکھا جو اِس کی موجودگی سے بے نیاز اپنے مصروف فون پر تھا۔ وہ مسکرا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ دروازہ بند کیا اور چیٹ پہ بحال ہوگئی۔

''اپنے روم میں آ گئی''۔

''تو ابھی تک کہاں تھی''۔

''بھائی کے روم میں تھی ،.....مطلب بھائی کے پاس گئی تھی کسی کام سے، وہیں بیٹھی تمھارے میسیجز کا جواب دے رہی تھی.......بٹ ڈونٹ وَرّی، آئی ایم بیک اِن مائی رُوم ناؤ۔۔۔بولو کیا پوچھ رہے تھے...؟''

''عافیہ.....تو یہ تم ہو؟''

دوسرے کمرے سے چیخ کی صورت اُٹھنے والی یہ آواز معروف کی تھی۔

............●●● ....

داغ

شادی کے چار سال بعد بھی بے اولاد ہونے کا صدمہ ہی کچھ کم نہیں تھا کہ اب بیوی طلاق کا مطالبہ کر بیٹھی تھی ۔ ہزار سمجھانے بجھانے بلکہ منت سماجت تک کرنے کے باوجود وہ اپنی ہٹ دھرمی پہ اڑی رہی اور ایک دن اسے اور اس کے گھر کو لات مار کر چلی گئی۔

دبے لفظوں میں نامردی کے الزام کا جو گولہ وہ جاتے جاتے اس کی جانب

داغ گئی تھی وہ ہائیڈروجن بم کی طرح پھٹ کراس کی انا اور اِمیج دونوں کے چیتھڑے اڑا گیا۔

گو یہ کام اتنا آسان نہیں تھا لیکن وہ کسی بھی طرح اس داغ کو مٹا کر اپنی ساکھ اور سکون بحال کرنا چاہتا تھا۔

والدین اور دوستوں کی رائے اور کوششوں سے بالآخر ایک نو عمر لڑکی کے ساتھ اس کی شادی ہوگئی۔لڑکی نے ڈیڑھ دو سال میں ہی اسے باپ بنا کر اس پر لگے بھدے داغ کو دھوڈالا۔لیکن اب اس کے اندر جو ایک اور داغ مسلسل پھیلتا جا رہا تھا اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا ازالہ وہ کیسے کرے۔

............●●● ....

ارتقا

نئے تعینات ٹیچر نے بائیو کی اپنی پہلی کلاس میں ہی طلبا کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

''اس طرح ان سب شواہد سے اب یہ بالکل واضح ہو چکا ہے کہ ہم انسان، یا یوں کہہ لو کہ زندگی، اپنی موجودہ شکل کو پہنچنے سے پہلے کئی مرحلوں سے گزری ہے......''

دوسری کلاس میں بھی اس نے نامیاتی ارتقا(EVOLUTION) پر ہی ڈسکشن آگے بڑھائی اور اس پر طلبا کو اپنی رائے اور تبصروں کا موقع دیا۔

''خرد بینی اور یک خلیہ جانداروں سے آہستہ آہستہ بڑے جانداروں نے ترقی پائی......سادہ ساخت جانوروں سے پے چیدہ ساخت والے جانوروں نے اور پھر ان سے انسان تک......دوسرے لفظوں میں ہم ایک لمبے پروسس کے بعد، جانور سے انسان بنے ہیں......اور پھر دھیرے دھیرے، جنگلی اور وحشی انسان سے مہذب

اور سماجی انسان بنے ہیں''۔

ایک بچہ جو ابھی تک صرف غور سے سن رہا تھا، پہلی بار کچھ پوچھنے کے لئے کھڑا ہوا۔

''سر یہ نامیاتی اِرتقااب رِیورس(reverse) نہیں ہوسکتا؟''

............●●● ....

☆......شبنم بنت رشید

جنم دن

جاوید نے اپنے دس سال کے بیٹے کے دسویں جنم دن پر شہر کے سب سے مہنگے اور مشہور ریسٹورنٹ سے پانچ پانچ سو کے کئی پیزا دو ہزار کا کیک چپس چاکلیٹ جوس اور کئی چیزیں خرید کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیئے۔ گاڑی میں سوار ہوتے ہی میلے کپڑوں میں ملبوس ایک بھکاری بچے نے اُس کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ جاوید نے دس روپے کا نوٹ اُس بچے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا جاؤ بچے عیش کرو۔ میں آج بہت خوش ہوں کیونکہ آج میرے بیٹے کا جنم دن ہے۔

............●●● ....

دوگلا پن

''امی، بابا، آپکو اور مجھے اپنے موبائیل فون سے اپنی نظریں ہٹائے بغیر کتابیں اور اخبار پڑھنے اور جلدی سونے کی تلقین کیوں کرتے ہیں؟" خود تو وہ............؟

............●●● ....

چائے

اشرف صاحب ہمیشہ رشوت خوری، سود اور دیکھا دیکھی کے سخت خلاف تھے۔ انہیں اپنی قابلیت، ذہانت اور حلال کمائی کے علاوہ صرف اور صرف چائے پانی پر یقین تھا۔

............●●● ....

☆......خالد بشیر تلگامی

روبوٹ

بچہ موبائل فون پر کارٹوں دیکھ رہا تھا۔ اسکرین کو غور سے دیکھتے ہوئے اچانک چہک کر بولا۔''پاپا، پاپا....دیکھیے یہ عورت اس موبائل میں کیسے فٹافٹ روٹی، سبزی، چاول، چائے، سب کچھ تیار کر رہی ہے۔''

باپ نے سمجھایا۔'' ارے بیٹا!...یہ عورت نہیں ہے ...یہ ایک روبوٹ ہے.... اس کو جو حکم دیا جائے بس کام پر لگ جاتا ہے....کسی بات کا انکار نہیں کرتا....اس کو نہ کبھی غصہ آتا ہے اور نہ کبھی تھکن محسوس کرتا ہے۔''

اتنا کہہ کر اس نے بیٹے سے پوچھا۔''جانتے ہو روبوٹ کیسا ہوتا

بچے نے فوراً جواب دیا۔''ہاں پاپا....ممّا جیسا۔''

............●●● ....

آئی ایم بزی

وہ اسٹیج پر اصلاح معاشرہ موضوع پر، سامنے میدان میں بیٹھے عوام الناس کو خطاب فرما رہے تھے۔ بڑی زوردار تقریر ہو رہی تھی۔

دورانِ خطاب اچانک موبائل فون کی گھنٹی ۔ چند ثانیے کے لئے خطاب روک کر فون پر نظر ڈالی۔ انجان نمبر تھا، اس لئے فون نہیں اٹھایا اور خطاب جاری رکھا۔

ابھی دو چار جملے ہی بولے تھے کہ پھر فون بج اٹھا۔اس بار بھی وہی نمبر تھا۔لہٰذا انہوں نے اس نمبر پر میسیج کیا: آئی ایم بزی ان اے کانفرنس۔پلیز ٹکسٹ می۔

اور خطاب کا سلسلہ جاری رکھا۔تھوڑی دیر بعد موبائل فون پر میسیج کا ٹیون بجا۔لیکن اس بار انہوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔

خطاب کے بعد کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے فون پر آئے میسیج کو دیکھا۔لکھا تھا:

''بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑرہا ہے کہ آپ کے والد
طویل بیماری کے بعد آج دن کے دس بجے انتقال فرما گئے۔
آخری وقت تک وہ آپ کو یاد کرتے رہے۔آخری رسوم کے
لیے نعش لے جاسکتے ہیں۔''

خیر اندیش
مینیجر اولڈ ایج ہوم

............●●● ....

عکس

ایک دکان کے پاس،اپنے دوست کے آٹھ سالہ بیٹے کے ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔''تم سگریٹ پینے لگے ہو؟''

اس نے مجھے اچانک دیکھ کر پہلے تو سلام کیا پھر میرے سوال کا جواب دیا۔''

نہیں انکل.... یہ تو پاپا نے مجھ سے منگوائی ہے۔''

مجھے کافی اطمینان محسوس ہوا۔

لیکن دو مہینے کے بعد، اسی دکان کے پاس ایک بار پھر میری نظر اس پر پڑی۔ اور اس بار جلتی ہوئی سگریٹ اس کے ہاتھ میں تھی۔

............●●● ....

☆......نیلوفر ناز نحوی

تھیلا

''یہ اتنے پیسے تجھے کہاں سے ملے؟''

''ایک آدمی آیا اس نے ایک تھیلا بیچ بازار میں رکھنے کو دیا''۔

''کیا تم نے رکھ دیا''۔

''ہاں......اسی کے تو دوسو روپے ملے۔ اب ماں کے لئے دوائی خرید سکتا ہوں''۔

''مجھے بھی دکھاؤ۔ وہ تھیلے کہاں سے ملتے ہیں۔ مجھے اپنے بابا کے لئے کھانا لانا ہے''۔

............●●● ....

بیس سال بعد

آج سے بیس سال پہلے ساری کائنات میں، میں واحد شخصیت تھی جو تمہاری توتلی زبان سمجھتی تھی۔ تمہاری خاموش نگاہوں کی باتیں سن پاتی تھی۔

اور آج بیس سال بعد بھی میرا وہی مقام ہے مگر جانے کیوں میں تمہاری کوئی بات نہیں سمجھ پاتی ہوں۔

............●●● ....

جہیز

''وہ لڑکی شادی کے لئے بہت اچھی ہے اور امیر زادی بھی ہے۔ بہت سارا جہیز بھی لائے گی۔''

''تم سے کس نے کہا''۔

''اس کا باپ بہت پیسہ والا ہے۔تم بھی تو چاہتے تھے کہ کوئی ایسی لڑکی ملے جو بہت سارا جہیز لائے''۔

''ہاں......وہ تو ٹھیک ہے لیکن......''

''لیکن ویکن چھوڑو۔شادی کے لئے ہاں کردو اور جہیز لینے سے منع بھی کرنا''۔

''مگر ایسا کیوں......؟''

''تم سوال بہت کرتے ہو۔ان کو احساس ہونا چاہئے کی تمہیں جہیز نہیں چاہئے''۔

............●●● ....

☆......عبدالمجید بھدرواہی

آپ بیتی

میں بچپن کے جھروکے سے جوانی کے انتظار میں جھانک رہا تھا کہ بڑھاپے نے دروازے پر دستک دے کر کہا؛

''میرے بعد موت آ رہی ہے"

............●●● ....

مدرس ڈے

انور نے اقبال کو صبح سویرے بن ٹھن کر ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ لئے دیکھ لیا۔

بھئی! کہاں جا رہے ہو؟"

بس اپنی والدہ صاحبہ کو سلام کرنے اور یہ پھولوں کا تحفہ دینے جا رہا ہوں'

''کہاں؟''

ان کو میں نے اولڈ ایج ہوم میں رکھا ہے۔

آج مدرس ڈے ہے نا، اس لئے جا رہا ہوں"

............●●● ....

شمع بجھنے سے پہلے

راشد کی تجہیز و تکفین کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس دوران اس کے جیب سے وہ تمام رقم نکلی، جو اس نے علاج و معالجہ اور دوائیوں کے لئے بچا کے رکھی تھی۔ ساتھ ہی ایک خط بھی ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ جان بوجھ کر منگنی کی رسم کی تاریخیں آگے کرتا تھا۔

کیونکہ اسے معلوم تھا کہ شمع بالآخر بجھنے ہی والی ہے۔

اس طرح اس نے لڑکی کی زندگی سے کھلواڑ نہ کیا ورنہ اس کی بھی زندگی برباد ہو جاتی۔

............●●● ....

☆......فلک ریاض

فکر

ظفر اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں سے شادی کی دعوت کھا کے آرہا تھا، لیکن بہت ہی اداس نظر آرہا تھا۔اس کے رشتہ دار نے مہمانوں کے کھانے کے لئے بارہ ضیافتوں کا انتظام کیا تھا اور ہر مہمان کے پلیٹ پر پانچ پانچ سو روپیہ کا نوٹ بھی رکھا تھا۔

ظفر بار بار یوٹیوب پہ کوئی ویڈیو ڈھونڈ رہا تھا۔۔آخر اسے ویڈیو مل ہی گئی۔ جس میں بتایا جا رہا تھا کہ اپنے جسم کا گردہ کہاں فروخت کیا جا سکتا ہے۔آخر تین بیٹیوں کا باپ تھا۔

............●●● ....

بھوت بابا

برکت علی اور ظفر علی ریٹائرمنٹ کے بعد سالوں بعد ملے۔ایک دوسرے کا حال پوچھنے لگے۔

''برکت علی کیا کر رہے ہو آج کل؟''

ظفر علی نے گلے ملتے ہوئے کہا۔

''ریٹائرمنٹ کے بعد بھوت بابا بن گیا ہوں۔''

''بھوت بابا''۔ظفر علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے کیا کہوں یار جب سے ریٹائر ہوا ہوں تو گھر میں ہی ہوتا ہوں۔

بڑھاپے کی وجہ سے ضعیفی آئی ہے۔سردی بھی بہت لگتی ہے۔رات کو مفلر اور ٹوپی پہن کے سوتا ہوں۔صبح تھوڑی دیر سے اٹھ کر ایک کونے میں چائے پیتا ہوں۔تو بہو روز صبح اپنے بچے کو گود میں لے کر میرے کمرے میں آتی ہے جو اپنے بچے کو ناشتہ کرا رہی ہوتی ہے۔میری طرف اشارہ کر کے اسے ڈراتی ہے۔

''دیکھو دیکھو بھوت بابا۔۔۔اگر نہیں کھاؤ گے تو میں بھوت بابا کے حوالے کر دوں گی''۔

ظفر علی نے یہ بات سنی تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔

............●●● ....

احساس

نجمہ نے شہر کے کالج میں داخلہ لیا۔تو گاؤں سے شہر تقریباً دس کلومیٹر سفر طے کر کے کالج پہنچ جاتی تھی۔کلاس کا ایک لڑکا اس پہ لٹو ہوا۔تقریباً ایک سال تک اس کے پیچھے تھا۔نجمہ کے دل میں بھی کچھ کچھ گل بوٹے کھلنے لگے۔کلاس کی زیادہ تر لڑکیاں اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ کبھی کسی ریسٹورنٹ،کبھی کسی پارک کے اندر گھومنے جایا کرتی تھی۔ابرار نے بھی نجمہ کو خط لکھا کہ اگلے سوموار میں آپ کا انتظار کروں گا ہوٹل دلربا کے اندر۔آنا اور ضرور آنا مجھے انتظار رہے گا۔وہ رات بھر اپنی ایک سہیلی کی طرف سے دیے گئے اس خط کو پڑھتی رہی۔۔کبھی خط کھولتی تو کبھی بند کرتی۔دل نے آواز دی" جاؤ نجمہ جاؤ۔۔اپنے آپ کو مت روکو۔آخر یہی تو عمر ہے محبت کی۔۔اور وہ بیچارہ کب سے منت سماجت کر رہا ہے۔۔۔"

مگر پھر اچانک اسے اپنے بابا کے مزدور ہاتھ یاد آئے۔اور ان کی شرافت

والی آنکھیں ۔ ماں کا چہرہ نظروں کے سامنے آیا کہ کیسے میرے ماں باپ مجھ پہ بھروسہ کر کے غربت میں مجھے پڑھا رہے ہیں۔ میں ان کا مان ان کا بھروسہ کیسے توڑوں۔ مجھے پہلے محنت کرنی ہے، کچھ بن کے دکھانا ہے، پیار محبت کے کھیل سے عموما بربادیاں نصیب ہوتی ہیں اور میں اپنے والدین کے آنکھوں کا خواب ہوں۔۔ مجھے یہ سب نہیں کرنا۔۔۔اس نے دماغ کا استعمال کر کے اس خط کو پھاڑ دیا۔۔اور لائٹ آف کر کے سوگئی۔

............●●● ....

☆......ایوب دلبر

خوش فہمی

ناہید خوش تھی کہ اس کا میاں بدیس سے اس پر روپیوں کی بارش کررہا تھا گرچہ وہ پچھلے پانچ سال سے ایک بار بھی گھر نہ آیا تھا۔ وہ میاں کے بھیجے ہوئے پیسوں سے عیش کی زندگی گذار رہی تھی اور اپنے پڑوسیوں، سکھی سہیلیوں سے کہتی " کیا ہوا جو میرے ہمدم گھر نہیں آرہے۔ پانچ سال ہو گئے ان کو بدیس میں لیکن مجھے کسی چیز کی کمی تھوڑی نا رکھتے ہیں؟ آج نہیں تو کل وہ ضرور ڈھیر سارے پیسے اور میرے لئے تحفے تحائف لے کر لوٹیں گے۔"

کچھ وقت کے بعد ناہید کا میاں بدیس سے لوٹ آیا اور اس نے واقعی نوٹوں کے ساتھ ساتھ اپنی بیگم کے لئے ایک مہنگا تحفہ بھی ساتھ لایا تھا!

ناہید کیلئے ایک سوتن اور اسے جنما ایک نیا مہمان!

............●●● ....

مست جگت کے باسی

رات کا کھانا کھانے کے برتن دھو کر صاف کرنے کے بعد راحیلہ نے اپنے گھر والوں کی طرف دیکھا، ان کے چہرے موبائل فونوں کے اسکرین کی روشنی سے چمک رہے تھے۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مست و مگن تھے۔ کسی نے کھانے بنانے کے لیے اس کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کے دن کے بارے میں پوچھا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی سوائے ٹیکنالوجی کے شور کے۔ اسے اپنا بچپن یاد آیا، ہنسی اور گفتگو سے لبریز۔ اس کی آنکھوں کے کونوں سے آنسو چھلک پڑے جب اسے احساس ہوا کہ اس

کے اپنے گھر میں احسان، شکرگزاری اور تعلق آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔

............●●●............

ممتا

دن کے گیارہ بجے ماں جی اور بابا گاؤ خانے میں گئے۔ پوچھنے پر باجی نے بتایا کہ گائے کو بچھڑا ہونے والا ہے۔ کچھ دیر بعد جب وہ دونوں کھانا کھانے کے لئے لوٹے تو ماں جی کے چہرے پر پریشانی کے آثار دکھ رہے تھے۔ معلوم پڑا کہ گائے کو بچھڑا دینے میں کچھ مشکلیں آ رہی ہیں۔ بعد دوپہر گائے کو بچھڑا تو ہوا لیکن کچھ شام ہوتے ہی وہ مر گیا۔ مردہ بچھڑے کو لے جا کر دور سنسان میں چھوڑ آئے لیکن ماں جی بہت غمزدہ لگ رہی تھیں۔ وہ بار بار جا کر گائے کو سہلاتیں، تھپکیاں دیتیں اور اس سے باتیں کرتیں۔

''ارے پگلی! تو چارہ کیوں نہیں کھاتی؟ تو اداس کیوں ہے؟ صبر کر بچھڑے کو دنیا میں نہیں رہنا تھا تو وہ چلا گیا۔ میں جانتی ہوں تجھ پر کیا بیت رہی ہوگی۔ میں نے سہا ہے پگلی! دل چھوٹا نہ کر۔ یہ آنا جانا تو لگا رہتا ہے۔ اس میں ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ دیکھ پریشان نہ ہو۔ چارہ کھا پگلی! دیکھ تجھے پھر سے بچھڑا ہوگا۔ تو خوش ہو جائے گی۔''

میں ماں جی کو گائے کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے ششدر رہ گیا۔

''ماں جی! تو یہ گائے کے ساتھ کیا باتیں کر رہی تھیں؟ عجیب بات ہے۔ وہ آپ کی باتیں بھلا کیا سمجھے گی؟ وہ تو نری حیوان ہے۔ اس کو کسی کے مرنے یا جینے سے کیا غرض؟''

''جانتی ہوں وہ بول نہیں سکتی۔''

ماں جی نے جواب دیا۔

"لیکن وہ جانتی ہے کہ درد کیا ہوتا ہے۔اولاد کا بچھڑنا کیا ہوتا ہے یہ بس ماں ہی جانتی ہے۔وہ ماں ہے اور میں بھی ماں ہوں۔ہمارے دکھ سکھ سانجھے ہوتے ہیں۔ یہ تو کیا جانے۔''

میں نے ماں جی کو دیکھا اور پھر ایک نظر گائے کو۔ گائے نے سر ماں جی کے گھٹنوں میں دے رکھا تھا اور دونوں کی آنکھوں میں جھڑی لگی ہوئی تھی!!!!!!!!!!

............●●● ....

☆......حبیب ہمراز

تصویر

ہم ایک سال سے وٹس ایپ پر ایک دوسرے کے ساتھ چیٹ کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے متعلق بہت کچھ جان چکے ہیں۔ کیوں نہ ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی تصاویر اور مکمل پتہ بھیج دیں۔ سہیل عباس نے راحیلہ کو تجویز پیش کی جو اُس نے خوشی خوشی قبول کی اور کہا کہ پہلے آپ اپنی تصویر اور ایڈرس بھیج دیں کیوں کہ پہل مردوں کی طرف سے ہی ہوتی ہے۔

اس طرح انہوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی تصاویر اور پتے بھیج دئے۔ سہیل عباس نے ایک دلکش تصویر بھیج دی۔ دوسرے دن انہوں نے بڈشاہ باغ میں ملنے کا پروگرام بنایا تا کہ شادی کیلئے ضروری اقدامات کئے جائیں۔ طے پایا کہ سہیل عباس سفید لباس پہنے ہاتھ میں سُرخ رومال لئے تالاب کے پاس پہنچیں گے تا کہ ایک دوسرے کی کسی دقت کے بغیر پہچان ہو جائے۔

سہیل عباس وقت مقررہ پر تالاب کے کنارے بینچ پر بیٹھا راحیلہ کے انتظار میں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد راحیلہ بھی پہنچی لیکن راحیلہ کو دھچکہ لگا۔ یہ تو وہ نہیں۔ لباس تو وہی ہے۔ لیکن تصویر؟ کیا معاملہ ہے۔ وہ چکرآ گئی۔ لیکن چٹکی میں وہ یہ سمجھ گئی کہ سہیل شرمیلا ہے۔ شاید اس لئے اُس نے ڈیڈی کو بھیجا ہے۔ مجھے باادب اس کے سامنے جانا چاہئے۔ اس نے سر پر اچھی طرح ڈوپٹہ سجایا اور باعزت واحترام اس کو سلام کیا اور کہا ڈیڈی جان کیا سہیل صاحب نہیں آئے۔ ڈیڈی لفظ سن کر سہیل عباس دم دبا کر بھاگ گیا۔

............●●● ....

گناہوں کا کفارہ

اس نے ایک بڑی رقم بطور کفارہ مقدس آدمی کی خدمت میں پیش کیا اور اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اُن کو درگذر کروانے کی دعا کیلئے درخواست کی۔ مقدس آدمی نے رقم سمیٹتے ہوئے دوسرے دن آنے کی ترغیب دی۔ دوسرے دن آتے ہی اُس کو گناہوں کے معاف ہونے کی اطلاع دی گئی اور کہا کہ اب تیرے نام کوئی گناہ نہیں ہے۔ گناہوں سے تیری جولی خالی ہوگئی ہے۔۔۔

خوشی سے پھولے نہیں سمایا اور دیوانہ وار اُچھلنے لگا۔

مقدس آدمی نے پوچھا۔۔۔ یوں کیا ہوا؟ یہ کیا دیوانگی ہے؟

کیا بتاؤں محترم۔۔۔ میں کتنا خوش ہوں۔ اب مجھے خالی جولی دبارہ بھرنے کی کھلی چھوٹ ملی ہے۔

............●●● ....

چوہے

دفتر کھلتے ہی تمام ملازم پریشان ہوگئے۔ ہاہا کار مچ گئی۔ صاحب کی حالت ہی تو عجیب ہوگئی۔ میزوں پر رکھی تمام فائلیں تتر بتر حالت میں فرش پر بکھری پڑی تھی۔ جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوا کہ چوہوں نے فائلوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ ہر فائل کو کتر کر رکھدیا ہے۔ وقت ضائع کئے بغیر صاحب نے فائلوں کا بغور جائزہ لیا اور ان کی مرمت کے لئے ٹینڈر نکالنے کے احکام صادر کئے۔ بغور جائزہ کے بعد عیاں ہوگیا کہ چوہوں نے فائلوں کے وہی حصے کتر کر رکھ دئے جن پر فرضی اخراجات کا اندراج ہوا تھا۔

............●●● ....

☆......عادل نصیر

فیصلہ

سات سال سے چلتے آرہے قتل کے مقدمے کا فیصلہ ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے آج حامد کے حق میں آیا تو اس نے مٹھائی کا بڑا ڈبہ لے کر گھر کا رخ کیا۔ گھر میں اس کی چار سالہ معصوم بچی نے مسکراہٹ سے باپ کا استقبال کیا اور مٹھائی پر جھپٹا مار کر باپ کی گود میں بیٹھ گئی اور معصومیت سے باپ سے پوچھا :

''ابا ! کیا آپ مجھے بھی اماں کی طرح جلا دو گے۔''

............●●● ....

آشیانہ

پرندے اضطراب میں دیوانہ وار مارے مارے پھر رہے تھے ۔ کتنے آشیانے ان شاخوں سے نیچے گر کر ختم ہو گئے تھے۔ جوں ہی عبداللہ نے اس دیودار کی طرف نظر دوڑائی۔ اسے وہ کسی پرانے اور خالی مکان کی طرح سنسان نظر آرہا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر وہ زار وقطار رونے لگا اور ادھر اُدھر بھاگ کر ان لوگوں پر چلانے لگا۔

''ظالمو! ہمیں نہیں چاہیے نئی سڑک، ہمیں جنگل چاہیے، جنگل کے پرندے چاہییں ۔تم ہم سے سڑک کے عوض سانس نہیں چھین سکتے۔ پڑھے لکھے قاتلو! تم کسی کا

گھر نہیں اجاڑ سکتے۔اسی ترقی کے نام پر ہیروشما کی سوکھی ریت آج بھی نمی کا انتظار کر رہی ہے۔ہمیں ترقی نہیں طاہیئے''۔

وہ چلاتا رہا مگر کسی کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔اسی دوران دھڑام کی آواز آئی اور عبداللہ یہ آواز سنتے ہی غش کھا کر گر گیا اور گرتے وقت اس کی آنکھوں نے محض اتنا دیکھا کہ وہ بڑا دیودار رسیوں میں جکڑا لاش کی طرح نیچے پڑا ہے اور اس پر بنے کئی آشیانے تنکے تنکے بکھر چکے تھے۔شام ہوتے ہوتے جنگل کے تمام آشیانے خاک ہو گئے جبکہ پرندے عبداللہ کے ساتھ قبر تک گئے اور اپنی چونچ سے قبر پر مٹی ڈالنے لگے۔

............●●● ....

نشہ

اسلم صاحب آج بڑے دنوں کے بعد منشیات فروخت کرنے والے ایک بڑے گروہ کو گرفتار کر کے خوشی خوشی گھر لوٹ رہے تھے۔انسپکٹر صاحب نے جب دیر رات گھر کا دروازہ کھولا تو برآمدے میں ان کی بیگم روتے روتے اوندھے منہ پڑے لخت جگر کو اٹھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

............●●● ....

☆......بشیر اطہر

میں ایسا کیوں کروں؟

سلیم اپنے والدین کو اولڈ ایج ہوم چھوڑنے گیا تھا مگر اولڈ ایج ہوم کے منیجر نے انہیں کھری کھری سُنائی اور وہ انہیں واپس لے آیا، تو بیوی نے سلیم کو دیکھتے ہی پوچھا۔ان کو اولڈ ایج ہوم چھوڑ کر کیوں نہیں آئے ہو؟

کیا اب ہمیں اپنی ساری زندگی ان کے ساتھ ہی گزارنی پڑے گی۔

سلیم نے ہمت سے کام لے کر کہا .....ہاں ساری زندگی ان ہی کے ساتھ گزارنی پڑے گی......۔

بیوی کو یہ بات برداشت نہ ہوئی اور جھٹ سے کھڑے ہو کر کہا۔پھر میں ہی اس گھر کو چھوڑ کر جاتی ہوں ..... آخر میری اس گھر میں کیا حیثیت ہے.....

ہاں بہتر ہے کہ تم اپنے میکے ہی چلی جاؤ۔ جہاں تمہارے بھائیوں نے تمہارے والدین کو اولڈ ایج ہوم میں رکھا ہے۔

میرے بھائیوں کے بارے میں ایسا مت کہو۔وہ ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔

ہاں بات تو سچ ہے جب وہ ایسا نہیں کر سکتے ہیں تو میں ایسا کیوں کروں؟

............●●● ....

شادی

شبنم کے باپ کو فوت ہوئے پندرہ سال ہوگئے اور بھائی نے شادی رچاتے ہی گھر چھوڑ دیا اب وہ اپنی بیمار ماں کے ساتھ اکیلی رہ رہی تھی۔کل اس کی

شادی ہونے والی ہے اور وہ اپنی سہیلی شائستہ کے پاس آئی اور بولی۔
شائستہ کل مہندی رات ہے تم بھی آجانا۔
او! واہ! یہ تو خوشی کی بات ہے کیک کہاں سے بنوایا؟
یہ سُن کر شبنم کی آنکھوں سے آنسوں رواں ہو گئے اور دھیمی آواز میں اپنی سہیلی کی بات کو ٹال کر کہنے لگی۔کیا تمہارے پاس کپڑے کا پُرانا جوڑا ہے، وہ مجھے دے دو تا کہ میں وہی پہن کر سسرال جا سکوں۔

............●●● ....

موت کا فرشتہ

پندرہویں صدی کا ایک انسان جو ایک غار میں تپسیا کر رہا تھا اکیسویں صدی میں اچانک اپنے گاؤں کی طرف نکل پڑا راستے میں موٹر سائیکلوں کی بہتات دیکھ کر حیران ہوا حیرانگی سے ایک راہ گیر سے پوچھنے لگا بھائی یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں کیا ہیں؟ یہ کہاں جا رہی ہیں؟
راہ گیر نے مذاق مذاق میں کہا کہ بھائی یہ موت کے فرشتے ہی۔۔
یہ سُن کر پندرہویں صدی کے انسان نے آہ بھر لی اور کہا کہ ہم نے ان کو کبھی نہیں دیکھا ہے۔شائد میں رستہ بھول گیا۔

............●●● ....

(ڈراما) اشرف عادل

رات کا دوسرا کنارہ

فہرست کردار

نمبر شمار	کردار	عمر
۱۔	مراق	30سال
۲۔	عدیل	40سال
۳۔	سحرش	35سال
۴۔	ڈرائیور (Extra)	40-50سال

----☆☆----

(1)

(ٹریفک رواں دواں ہے۔ٹریفک چلنے کاEffect۔مشغول سڑک۔
پیش منظر میں ایک کار کے چلنے کی آواز)

مراق: ڈرائیور یہاں سےLeft Turnلے لو۔

ڈرائیور: لیکن صاحب جی؟

مراق: Left Turnلے لو۔

ڈرائیور: جی صاحب

(گاڑی کی سپیڈ میں تبدیلی کےEffects)

ڈرائیور: صاحب جی آج آفس میں آپ کا پہلا دن ہے سبھی لوگ انتظار کررہے ہوں گے۔

مراق: کوئی اور بھی میری راہیں دیکھ رہا ہوگا۔ابھی دس بجنے میں بیس منٹ باقی ہیں۔ہم وقت پرآفس پہنچ جائیں گے۔میں وقت کے ترازو پر دل کی دھڑکنیں بھی تول لیتا ہوں۔

ڈرائیور: لیکن ہمیں جانا کہاں ہے صاحب؟

مراق: قبرستان

ڈرائیور: (چونک کر) صاحب جی۔کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

مراق: ہاں ۔ قبرستان۔کوئی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ بس یہاں۔ اس کافی شاپ(Coffee Shop) کے بغل میں روک لو۔

(گاڑی بریک کے بعد رک جاتی ہے۔ بریک لگنے اور گاڑی رکنے کی آواز)

مراق: تم میرا یہی انتظار کرنا۔

ڈرائیور: جی صاحب۔

(کھڑکی کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز)

مراق: (Overlap)۔ یہ رہا قبرستان کا صدر دروازہ۔ اب میں اسے کھولتا ہوں۔

(ایک پرانے لوہے کے دروازے کے کھلنے کی آواز)

مراق: قبرستان میں دیوانہ وار داخل ہوتے ہوئے......

یہ رہا ہمارا آبائی قبرستان۔ یہاں اس جگہ میرے دادا اور دادی کے قبروں کے بیچ میری نوجوان ماں اور میرے والد کی قبریں ہیں۔اس قبر کے کتبے پہ میری ماں سحرش کا نام لکھا ہے۔ پیدائش ۱۹۷۰ء ۔ موت ۲۰۰۰ء اس کے ساتھ والی قبر کے کتبے پر میرے والد کا نام لکھا ہے۔''عدیل'' پیدائش ۱۹۶۸ء۔موت ۲۰۱۷ء۔

لیکن ابو جی۔آپ کہاں مر چکے ہیں؟ آپ تو آج بھی میرے اندر سانس لے رہے ہیں۔میرے اندر آپ آج بھی زندہ ہیں۔ابو آج آپ کا خواب پورا ہو چکا ہے۔آپ مجھے ایک آئی اے ایس آفیسر بنانا چاہتے تھے۔لیجئے میں بن گیا۔آج آفس میں میرا پہلا دن ہے۔آپ کو یہ بتانے آیا ہوں۔لیکن میں مما سے ناراض ہوں۔ بہت

ناراض۔ وہ آپ کو اور مجھے چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ آپ سے ہمیشہ جھگڑتی تھی۔ مجھے اور آپ کو چھوڑ کر جانے کے بعد انتقال کر گئی لیکن آپ کی عظمت دیکھئے۔ آپ نے اسے پھر بھی اپنے اس آبائی قبرستان میں دفن کیا۔
ابو میں مما سے بہت ناراض ہوں۔ آپ نے میرے لیے دوسری شادی کی تھی تا کہ مجھے ماں کی کمی محسوس نہ ہو۔ لیکن جب نئی مما نے میرے ساتھ برا سلوک کرنا شروع کر دیا آپ نے اُسے بھی چھوڑ دیا۔ میرے لیے۔ فقط میرے لیے۔ اچھا ابو میں جا رہا ہوں۔

(تھوڑی سی موسیقی)

(Change Over)

-------☆-------

(2)

خود کلامی:

مراق: ....!!

آج میری زندگی کا بہت ہی اہم دن تھا۔ جو خوب صورتی کے ساتھ آفس میں گذرا۔ لیکن مجھے نیند کیوں نہیں آ رہی ہے۔ میں اپنے پلنگ پہ آدھے گھنٹے سے کروٹیں بدل رہا ہوں۔ (جماہی لیتے ہوئے)

رات کے پونے بارہ بج رہے ہیں۔دراصل ابو جی کو میں مِس (Miss) کرر ہاہوں۔اُٹھ۔مراق اُٹھ۔نیندنہیں آنے والی۔چلو مراق میاں ایسا کرتے ہیں ابو جی کا بریف کھولتے ہیں۔وہاں کونے میں رکھا ہوا ہے۔ پرانی یادوں سے دل کو سکون ملتاہے۔ میں یہ بریف کھولتا ہوں۔(بریف کیس کھلنے کی آواز)۔او۔یہ قلم۔خوب صورت۔اس قلم سے ابو جی لکھتے تھے۔یہWriting Pad۔کتنا عمدہ ہے۔یہ سبز رنگ کی ڈائری۔ہاں۔اسے میں نے............!! کبھی نہیں دیکھا تھا پہلے۔چلو دیکھتے ہیں۔اس میں کیا لکھا ہے۔ہاں یہ تو مما کی ڈائری ہے۔لیکن ابو نے اس ڈائری کو سنبھال کے کیوں رکھا ہے۔شاید۔مما کا کوئی گہراراز چھپا ہوااس ڈائری میں۔

ہاں۔ابو جی تو فرشتہ صفت انسان تھے۔اسی لیے اس ڈائری کو محفوظ رکھا ہوگا۔چلو پڑھتے ہیں۔شاید مما کو ڈائری لکھنے کی عادت تھی۔ پہلے ہی صفحے پر لکھا ہے۔''عدیل اب مجھ سے دور دور رہنے لگا ہے''۔ہاں۔یہ تو مجھے معلوم ہے ماں کی بے مروتی سے ابو بہت اداس رہتے تھے۔اب تو میں اس پوری ڈائری کو پڑھ کے ہی دم لوں گا۔ میرے پاس پوری رات پڑی ہے۔

(ایسی موسیقی جسے لگے کہ Flash Back آرہاہے)

(Cut to)

FLASH BACK

-------☆-------

(3)

(FLASH-BACK-STARTS)

(ڈنر کرنے کے Effects۔ برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں)

سحرش: عدیل۔عدیل.....

عدیل: ''ہوں''۔ہاں۔ہاں۔کیا ہے؟

سحرش: آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟

عدیل: کھا جو رہا ہوں۔

سحرش: نہیں۔کھا رہے ہیں آپ۔کیا سوچ رہے ہیں؟

عدیل: میں۔میں سوچتا ہوں۔نہیں۔نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ میں کیوں سوچوں۔

سحرش: چھوڑیئے۔اب کھانا کھایئے

عدیل: او۔ہو۔میں کھاؤں گا۔خود کھاؤں گا۔

سحرش: چلئے۔اب شروع کیجئے۔

عدیل: (Overlap) کیسے کھاؤں۔ پیٹ تو بھر چکا۔میں پہلے ہی زارا کے ساتھ Restaurant میں ڈنر کر چکا ہوں۔

سحرش: پھر سوچنے لگے ہیں آپ؟

عدیل: نہ۔نہ۔نہیں۔نہیں۔میں کھا رہا ہوں۔

سحرش: عدیل۔آپ کے اندر عجیب سی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔

عدیل: سحرش۔ کیا کہہ رہی ہوتم۔ دراصل تمہارے جذبات کا رنگ تبدیل ہورہا ہے۔

سحرش: نہیں عدیل۔ آپ کی سوچ پر کوئی بیرونی طاقت حاوی ہورہی ہے۔

عدیل: بیرونی طاقت؟

سحرش: ہاں بیرونی طاقت۔ باہر کی سوچ گھر کے اندر داخل ہوجائے گی تو گھر کا مزاج بگڑ جائے گا۔

عدیل: (Overlap)۔ بیرونی طاقت۔ مطلب میرے ذہن پر زارا سوار ہورہی ہے۔ اسے کیسے پتہ چلا۔
شاید میرے Behaviour میں تبدیلی آرہی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

سحرش: اب کیا سوچ رہے ہیں۔

عدیل: کُہ۔ کہ۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔

سحرش: پھر کھانا چھوڑ دیا۔ سامنے پڑا ہے۔ کم از کم روٹی کا تو احترام کریں۔ سب جھگڑے تو روٹی کے ہی ہیں۔

عدیل: نہیں سحرش جھگڑے کسی اور چیز کے ہیں۔

-------☆-------

(CHANGE OVER)

(4)

(پس منظر میں ہلکی موسیقی)

عدیل: تمہارے ہجر کا مزا اٹھا کے دیکھتے ہیں ہم
چراغ آندھیوں میں اب جلا کے دیکھتے ہیں ہم

زارا: ہر ایک ناگ جدائی کا مجھ سے لپٹا تھا
کسی کا قُرب تڑپتا رہا ہے میرے لیے

عدیل: بہت خوب زارا۔ تم نے شعر کا جواب شعر سے دیا۔ تمہاری ذہانت کا جواب نہیں۔

زارا: لیکن یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔

عدیل: سوال۔ کون سا سوال۔ تم نے کب پوچھا؟

زارا: میں نے اپنا سوال پوچھ لیا۔ کئی بار۔

عدیل: لیکن میں نے سُنا نہیں؟

زارا: وہ تمہارے شعور کا قصور ہے۔

عدیل: لیکن تم نے سوال کب پوچھا۔ میں نے تمہارے سوال کا ایک لفظ بھی نہیں سُنا۔

زارا: کیا سوال کو لفظوں کا پیرہن پہنانا ضروری ہے؟

عدیل: سوال کو زبان کی سولی پہ چڑھانا پڑتا ہے۔

زارا: تا کہ لفظ رسوا ہو جائے؟

عدیل: نہیں تاکہ جواب کی تشہیر ہوجائے۔

زارا: جذبات شہرت کے بھوکے نہیں ہوتے۔

عدیل: زارا۔میرے جذبات فقط جذبات نہیں۔ان سے حقیقت کا رنگ ٹپکتا ہے۔یہ میرے دل کے ترجمان ہیں۔

زارا: پھر تم نے میرا سوال کیوں نہیں سُنا۔

عدیل: میں پھر کہوں گا کہ تم نے کبھی پوچھا ہی نہیں؟

زارا: آنکھوں سے سوال نہیں پوچھا جاسکتا ہے؟

عدیل: میں تمہاری آنکھوں کی زبان سمجھتا ہوں لیکن زبان پھر بھی زبان ہوتی ہے۔جذبات کو لفظوں کا لباس پہننا ہی پڑتا ہے۔

زارا: تو پھر آج میرا سوال میری زبان پر ضرور آئے گا۔

عدیل: موقع بھی ہے اور دستور بھی۔ یہ خوب صورت رستوران۔ اور یہاں کی مہکی مہکی فضا۔جب آج نہیں کہو گی تو پھر کب۔

زارا: ہاں ۔ضرور کہوں گی ۔تم مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا کیوں نہیں بنا لیتے۔

عدیل: کس طرح زارا۔

زارا: عدیل تمہیں مجھ سے شادی کرنا پڑے گی۔ورنہ.....

عدیل: ورنہ؟

زارا: ہمیں یوں ملنا نہیں چاہیے۔ہم محبت کے اُس چوک میں کھڑے ہیں جس کے دو راستے ہیں۔ایک تمہارے گھر کی طرف جاتا ہے تمہاری بیوی اور بچے کے پاس دوسرا میری محبت کی طرف جاتا ہے تمہاری محبوبہ اور پیار کے پاس۔

عدیل: عجیب چوک ہے یہ محبت نگر کا۔
زارا: تمھیں ایک راستہ چُننا ہوگا؟
عدیل: زارا۔ وہ تو میں نے پہلے ہی چُن لیا ہے۔
زارا: مجھے بھی بتاؤ عدیل۔ کون سا راستہ تم نے چُن لیا ہے۔
عدیل: وہی راستہ جو تمہاری محبت کی طرف جاتا ہے۔
زارا: شکریہ۔ مجھے تمہارے چناؤ پر فخر ہے۔ راستہ پُر خار ہے مگر منزل خوب صورت۔
عدیل: لیکن مجھے فقط یہ راستہ خیالی نقشے پر نہیں چاہیے۔ بلکہ تمھیں اس خیالی نقشے میں حقیقت کے رنگ بھرنے ہوں گے۔
عدیل: زارا۔ نقشے کی مدد سے ہی عمارتیں بنتی ہیں۔
زارا: مجھے پھر عمارت چاہیے۔ وہ بھی جلد۔
عدیل: پرانی عمارت کا کیا کروں؟
زارا: چھوڑ دو پرانی عمارت۔ اگر نیا محل چاہیے تو۔
عدیل: ہاں۔ نیا محل تو پسند ہے اور چاہیے بھی۔
زارا: تمھیں تو پرانی عمارت سے کوئی شکایت بھی نہیں؟
عدیل: شکایت تو نہیں ہے لیکن چھوڑنے کا ارادہ تو ہے۔
زارا: کیسے چھوڑ پاؤ گے؟۔ کچھ تو بہانہ چاہیے۔
عدیل: بہانہ نہیں ہے لیکن بہانہ بنایا جا سکتا ہے۔
زارا: تو پھر بہانہ بنانا شروع کر دو۔
عدیل: ہاں۔ آج سے ہی شروع کرتا ہوں بلکہ ابھی سے۔
زارا: مطلب؟

عدیل: چلتے ہیں گھر کی طرف۔تا کہ بہانے پہ کام کیا جاسکے۔
زارا: اچھا بہانہ ہے۔یہاں سے کھسکنے کا۔ہاہاہا۔
(دونوں ہنستے ہیں)

(تھوڑی سی موسیقی)

(Change Over)

-------☆-------

(5)

عدیل: سحرش!سحرش (بلند آواز میں)
سحرش: کیا بات ہے عدیل۔آپ نے آسمان سر پہ کیوں اٹھا رکھا ہے۔ (دور سے مائک کی طرف آتے)
عدیل: میں نے سر پہ اٹھا رکھا ہے۔میں نے؟
سحرش: اور کیا۔پچھلے ایک مہینے سے میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ بدلے بدلے سے نظر آرہے ہیں۔بات بات پر جھگڑتے ہیں۔
عدیل: دیکھو سحرش! میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔مجھے دفتر جانے کے لیے دیر ہو رہی ہے۔
سحرش: عدیل۔آخر ماجرا کیا ہے۔

عدیل: میرا رومال نہیں مل رہا ہے۔
سحرش: بس اتنی سی بات۔اتنی سی بات پر آپ اتنا بگڑ رہے ہیں۔
عدیل: یہ اتنی سی بات ہے۔یہ۔اتنی سی بات ہے؟
سحرش: دیکھئے!عدیل۔میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مجھے آج پھر ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔
عدیل: میں نے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے کب روکا ہے تم کو۔
سحرش: ہاں۔کبھی روکا تو نہیں لیکن کبھی آپ میرے ساتھ نہیں آئے۔کبھی یہ نہیں پوچھا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا۔کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تم کو کس بیماری نے گھیر رکھا ہے۔آخر تمہاری صحت کی عمارت میں کون سی بیماری کے جراثیم داخلہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔کبھی پوچھا آپ نے؟
عدیل: دیکھو سحرش۔مجھے دفتر پہنچنا ہے ۔بہت جلدی میں ہوں۔میرا رومال کہاں ہے بس اتنا بتا دو۔
سحرش: رومال آپ کے سامنے پڑا ہے۔
عدیل: کہاں؟
سحرش: ٹیبل پر، یہ اس ٹیبل پر۔
عدیل: ٹھیک ہے۔تب سے کیوں نہیں بتایا؟
سحرش: آپ نے بولنے کا موقع ہی کب دیا؟ آپ تو فقط اب کڑوا بولتے ہیں بہترین انسان اپنی میٹھی زبان سے ہی پہچانے جاتے ہیں ورنہ اچھی باتیں دیواروں پر بھی لکھی ہوتی ہیں۔
عدیل: اچھا تو یہ بات ہے اب میں تمہارے لیے بہتر نہیں ہوں۔

سحرش: میں نے ایسا تو نہیں کہا۔

عدیل: میں مزید بحث نہیں کرنا چاہتا اب۔ میں لیٹ ہو رہا ہوں۔ جا رہا ہوں۔

(تھوڑی سی موسیقی)

(Change Over)

-------☆-------

(6)

(پس منظر میں ہلکی موسیقی)

عدیل: آج ہم پھر اس شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں چائے نوش فرما رہے ہیں۔ (چائے پینے کے Effects)

زارا: عدیل! چائے تو بہانہ ہے۔

عدیل: ہاں زارا دراصل ہم دل کی آگ یہاں بجھانے آتے ہیں۔

زارا: ہمارے دل کب تک جلیں گے۔آخر کب تک؟

عدیل: جلنا ان کی تقدیر ہے۔

زارا: عدیل میری بات کو مت ٹالو۔ مجھے جواب چاہیے۔

عدیل: زارا۔تمہاری انگلی میں یہ انگوٹھی بہت جچ رہی ہے۔

زارا: میری بات کو پھر ٹالا جا رہا ہے ۔ میری انگلی میں یہ انگوٹھی اچھی نہیں لگتی۔انگوٹھی انگلی کی وجہ سے اچھی لگ رہی ہے ۔ By the way

مجھے یہ انگوٹھی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی ہے۔

عدیل: مگر کیوں؟

زارا: ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔

عدیل: پوری کیجئے سرکار؟

زارا: دنیا میں دو لوگوں سے دور رہنا چاہیے۔ایک وہ جو آپ میں ایسے عیب نکالتا ہے جو آپ میں نہیں دوسرا وہ جو اچھائی آپ میں نہیں اور وہ اس اچھائی کو آپ سے منسلک کرے۔

عدیل: ہاہاہا۔ ہاں یہ گستاخی ہم نے ضرور کی کہ انگوٹھی کو آپ کی انگلی سے زیادہ ترجیح دی۔اس کے لیے بندہ شرمندہ ہے۔

زارا: چلئے کوئی بات نہیں۔مگر آئندہ خیال رکھیں۔

عدیل: جو حکم شہزادی صاحبہ۔

زارا: اب آتے ہیں اصلی بات پہ۔

عدیل: او مائے گاڈ!اب تک ہم سوکھے دریا میں مچھلیاں پکڑ رہے تھے کیا؟

زارا: جی ہاں عدیل صاحب!

عدیل: لیکن میں یہ مچھلی پکڑ کے رہوں گا۔

زارا: یہ مچھلی آسانی سے پکڑ میں نہیں آ سکتی۔اس کے لیے تم کو سمندر میں اترنا ہوگا۔جال میں یہ مچھلی پھنسنے والی نہیں۔

عدیل: میں سمندر میں اترنے کے لیے تیار ہوں۔میری سنہری مچھلی۔

زارا: کنارا کب چھوڑ دو گے۔تم نے اب تک سحرش کو طلاق کیوں نہیں دی۔

عدیل: ماحول بن رہا ہے۔لکڑیوں پر تیل چھڑک چکا ہوں۔اب فقط چنگاری دکھانا باقی ہے۔

زارا: پھر چلتے ہیں۔سیدھے یہاں سے نکل کر گھر کی راہ لو اور آگ میں ہاتھ ڈال کر دکھاؤ۔

(تھوڑی سی موسیقی)

(Change Over)

-------☆-------

(7)

سحرش: آپ کو Breakfast نہیں کرنا ہے۔آپ کے سامنے رکھا ہوا ہے۔

عدیل: میں خود کروں گا۔تمہارے حکم کی ضرورت نہیں ہے۔

سحرش: میں حکم کہاں دے سکتی ہوں۔

عدیل: دیکھو! سحرش میں بحث کے مُوڑ میں نہیں ہوں۔

سحرش: عدیل۔آپ بچوں کی طرح موبائل کا استعمال کر رہے ہیں۔

عدیل: سحرش۔میں موبائل ذہنی عیاشی کے لیے استعمال نہیں کر رہا ہوں بلکہ دفتر کا کام کر رہا ہوں۔

سحرش: اب توBreakfast کیجئے۔

عدیل: میں نے کتنی بار تم سے کہا کہ میرے ذاتی کاموں میں دخل اندازی نہ کیا کرو۔ ویسے بھی میں اب تم سے بور ہو چکا ہوں۔ کیوں نہ میں اب تم کو صاف صاف بتا دوں۔

سحرش: کیا بتانا ہے۔ یہی کہ.....

عدیل: یہی کہ میں تم کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔

سحرش: ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ اس کی نوبت آج نہیں تو کل آنے والی تھی۔

عدیل: کیا۔ کیا۔ کیا تم کو معلوم ہے۔

سحرش: ہاں مجھے معلوم ہے آپ کو زارا نام کی ایک لڑکی سے محبت ہوگئی ہے اور آپ اُسے بہت جلد شادی کرنے والے ہیں اسے پہلے مجھے طلاق دینے والے ہیں۔

عدیل: کس نے بتایا یہ سب تم کو؟

سحرش: ہے میرا کوئی خیر خواہ۔

عدیل: کون ہے وہ؟

سحرش: تمہارا رومال جس پر زارا کا نام رقم ہے اور اس رومال سے میں نے کئی بار لپ اسٹک کے نشان دھوڈالے ہیں اور بار بار آپ وہ رومال ڈھونڈتے رہے اور میرا شک یقین میں اس وقت بدل گیا جب میں نے اپنی آنکھوں سے آپ دونوں کو ہوٹل سٹی لُک (City Look) سے نکلتے ہوئے دیکھا۔

عدیل: سحرش میں واقعی تم کو طلاق دے رہا ہوں۔

سحرش: اس کی مجھے پوری امید تھی آپ کے بدلتے ہوئے تیور سے صاف ظاہر ہے لیکن میری ایک گذارش ہے۔

عدیل: گذارش؟

سحرش: ہاں طلاق تم مجھے ایک مہینے کے بعد دوگے اور میں خوشی سے قبول کروں گی۔

عدیل: ایک مہینے کے بعد کیوں؟

سحرش: کیوں کہ میں ایک ماں ہوں؟

عدیل: میں کچھ سمجھا نہیں۔

سحرش: مراق کے امتحان پرسوں سے شروع ہو رہے ہیں ۔میں نہیں چاہتی کہ اُس کی پڑھائی پر کوئی برا اثر پڑے۔

عدیل: ٹھیک ہے ایک مہینے کے بعد ہی سہی۔

سحرش: لیکن؟

عدیل: لیکن؟

سحرش: لیکن آپ کو ایک Agreement کرنا پڑے گا۔

عدیل: کیسا Agreement؟

سحرش: آپ کو اس ایک مہینے کے دوران بالکل اسی طرح میرے ساتھ پیش آنا ہوگا جس طرح آپ اس وقت پیش آتے تھے جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔آپ کو مجھے کھانا کھلانا ہوگا اپنے ہاتھوں سے۔مجھے کبھی کبھی گود میں اٹھانا ہوگا۔جس طرح پہلے اٹھایا کرتے تھے اور وہ تمام حرکتیں کرنی ہوگی جو اس وقت کرتے تھے۔

عدیل: نہیں۔نہیں۔یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔

سحرش: گھبرایئے مت۔ یہ سب ایک ڈرامہ ہوگا تاکہ مراق کوکوئی شک نہ ہو۔

عدیل: ٹھیک ہے میں یہ سب کروں گا فقط تم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے۔

(تھوڑی سی موسیقی)

(Change Over)

-------☆-------

(8)

سحرش: عدیل مجھے اپنی گود میں اٹھالو۔ دیکھو باہر لان میں مراق کمرے کی طرف آرہا ہے۔

عدیل: کیا مصیبت ہے۔ اٹھانا تو پڑے گا ہیAgreement کے مطابق۔آ! آ! آ۔(اٹھانے کی کوشش میں) آہ۔آ۔(اسی میں دروازہ کھلتا ہے)

سحرش: مجھے واپس چھوڑ ناوہ کمرے میں داخل ہورہا ہے۔

عدیل: آ! آ۔ (گرنے کی آواز)

(دروازہ پھر سے بند ہوجاتا ہے)

سحرش: شکریہ عدیل۔ وہ چلا گیا۔ بہت محنت کرتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ آئے اے ایس آفیسر بنے۔

عدیل: میں چاہتا ہوں کہ Agreement جلد از جلد ختم ہو جائے تا کہ میری زنجیریں کھل جائیں۔

سحرش: بس کچھ دنوں کی بات ہے پھر آپ آزاد ہیں۔

عدیل: شکریہ۔OK۔ میں جا رہا ہوں کسی سے ملنے۔

(تھوڑی سی موسیقی)

(Change Over)

-------☆-------

(9)

سحرش: ارے ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں جاڑو لگا رہے آپ۔

عدیل: دیکھو سحرش مجھے یہ کام کرنے دو۔ مجھے بڑا مزہ آ رہا ہے تمہارے کام کرنے میں۔

سحرش: چھوڑ دو یہ جاڑو مجھے کام کرنے دو۔

عدیل: سحرش۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دیکھو زرد پڑ چکا ہے تمہارا چہرہ۔ تم آرام کرلو۔

سحرش: کچھ نہیں ہوا مجھے۔

عدیل: Please سحرش۔ مجھے سکون ملتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ شادی کے پہلے سال واپس آ رہے ہیں۔

سحرش: ہاہاہا۔گزراوقت واپس نہیں آتا ہے۔ندی پہاڑ سے نیچے اترتی ہے لیکن پہاڑ کی جانب واپس نہیں مُڑتی۔

عدیل: سحرش۔یہ زندگی ہے۔پہاڑ کی اترائی نہیں۔

سحرش: عدیل۔زندگی بہتا سمندر ہوگئی ہے۔

عدیل: اب چھوڑ دوان باتوں کو۔

سحرش: کیسے چھوڑ دوں۔Agreement تین دن کے بعد ختم ہورہا ہے۔

عدیل: سحرش۔ جب سے اس Agreement کے تحت میں نے تمہارے احکامات پر عمل کیا۔مجھے زندگی میں سکون ملنے لگا۔تمہیں گود میں اٹھاتا ہوں تو خوشیاں ملتی ہیں۔تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا ہوں تو گھر میں بہار آنے لگتی ہے۔مراق کو دکھانے کے لیے تمہارے کام میں ہاتھ بٹانے لگتا ہوں تو اس گھر کی دہلیز پر جیسے فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔سحرش۔میں بھٹک گیا تھا۔دراصل میاں بیوی کے درمیان جب خلیج پیدا ہوتی ہے تو مرد کسی زارا جیسی لڑکی کی زلفوں کا اسیر بن جاتا ہے۔

سحرش: میں جانتی ہوں کہ آپ آج بھی مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ وہAgreementاب برائے نام رہا۔آپ اب اس لڑکی سے ملتے بھی نہیں۔ہماری محبت کا معاہدہ میرے مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوگا۔

عدیل: ایسا مت کہوسحرش۔ابھی تو ہمیں ایک ساتھ زندگی کا سفر اور وہ بھی طویل سفر طے کرنا ہے۔

سحرش: اب میں آپ کا مزید ساتھ نہیں دے سکتی۔
عدیل: مجھے معاف کر دو۔سحرش۔میں تمہارا گنہگار ہوں۔
سحرش: عدیل۔میں تم سے کبھی ناراض تھی ہی نہیں۔کیوں کہ مجھے آپ کی محبت پر پورا یقین تھا اور آج بھی ہے۔کیوں کہ جس کے پاس امید ہے وہ لاکھ بار ہار کر بھی نہیں ہارتا۔
عدیل: پھر تم میرا ساتھ کیوں نہیں دے سکتی؟
سحرش: کیوں کہ زندگی ساتھ چھوڑ رہی ہے۔
عدیل: میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔
سحرش: عدیل میں چند دنوں کی مہمان ہوں۔ مجھے ایک لا علاج مرض ہو چکا ہے۔بس چند دنوں کی مہمان ہوں۔
عدیل: نہیں۔نہیں۔نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا ایسا نہیں ہوسکتا ہاں۔اب میری سمجھ میں آرہا ہے تم جو بار بار ڈاکٹر کے پاس کیوں جارہی تھی۔میں کتنا بد بخت ہوں کہ میں نے کبھی تم سے یہ نہیں پوچھا کہ تمہیں ہوا کیا ہے۔میں سمجھ رہا تھا کہ تمہیں کوئی معمولی سی بیماری ہے۔
سحرش: بیماری معمولی نہیں ہے عدیل۔یہ بیماری جان مانگتی ہے فقط جان۔
عدیل: کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تمہاری جان کے بدلے میری جان.....
سحرش: نہیں۔نہیں۔خدا آپ کو سلامت رکھے۔آپ کے کاندھوں پر بہت سارا بوجھ ڈال کے جارہی ہوں۔ابھی آپ نے مراق کو آئی اے ایس آفیسر بنانا ہے۔وعدہ کریں۔ وعدہ کریں۔کہ آپ میری آرزو پوری کریں گے۔

عدیل: میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔

سحرش: شکریہ۔

عدیل: تم نے پہلے کیوں نہیں کہا کہ اتنی بڑی بیماری نے تم تم کو جکڑ رکھا ہے۔

سحرش: میں نہیں چاہتی کہ مراق کے امتحان پر کوئی اثر پڑے۔ میں نے اس راز کو راز ہی رکھا اب تک۔ اب Agreement بھی ختم ہو چکا ہے۔ اور چند دن بعد مراق کے امتحان بھی ختم ہو جائیں گے۔ تب تک راز، راز ہی رہنا چاہیے۔

عدیل: راز، راز ہی رہے گا لیکن تم کو میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا ہوگا۔

سحرش: وقت نکل چکا ہے۔ لیکن میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گی یہ میری تمنا بھی تھی اور آرزو بھی۔

عدیل: چلو سحرش۔ اٹھو ہم ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ میں ایک اچھے ڈاکٹر کو جانتا ہوں۔ وہ اچھا مشورہ دے سکتا ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔

سحرش: عدیل۔ میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گی۔ مگر۔ مگر۔

عدیل: ہاں بولو۔ سحرش۔ مگر کیا؟

سحرش: مگر میری ایک اور آرزو ہے کیا تم پوری کرو گے۔

عدیل: ہاں بولو۔ سحرش۔

سحرش: میرے مرنے کے بعد، آپ کو زارا کے ساتھ شادی کرنی پڑے گی۔

عدیل: نہیں نہیں ایسا مت کہو۔ ایسا مت کہو!

سحرش: وعدہ کیجئے۔ عدیل وعدہ کیجئے۔ آپ کو یہ شادی کرنی ہی پڑے گی کیوں کہ میں چاہتی ہوں کہ مراق کبھی ماں کی کمی محسوس نہ کرے۔ وعدہ کیجئے۔

عدیل: ہاں سحرش۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں۔ وعدہ.....

(موسیقی) Cut to -1st

(Change Over)

FLASH-BACK ENDS

-------☆-------

Scene No.1 resumes again

صبح کی اذان خوب صورت آواز میں:

مراق: (اذان پس منظر میں جاتی ہوئی)
اومما۔ اومما۔ مجھے معاف کردو۔ مجھے معاف کردو۔ تم نے اتنی بڑی قربانی دی میری خاطر۔ اور میں تم کو غلط سمجھتا رہا۔ مجھے آئی اے ایس آفیسر بنانے کا خواب دراصل تمہارا تھا۔ ابو کا نہیں۔ ابو نے مجھے اتنی دیر تک اندھیرے میں کیوں رکھا۔ میری غلط فہمی دور کیوں نہیں کی۔ اب اندھیرے دور ہورہے ہیں۔ سورج سچائی کا پیغام لےکر نکل رہا ہے۔ میں سب سے پہلے قبرستان جاؤں گا۔ اپنی ماں کو منوالوں گا۔ ماں مجھے معاف کردے گی۔ ورنہ میری ساری عبادت ضائع ہوجائے گی۔ ورنہ جنت میں میرا داخلہ ممنون قرار دیا جائے گا۔ جنت تو ماں کے قدموں میں ہوتی ہے۔ (اشہدانا محمد رسول اللہؐ)

(اذان کی آواز پیش منظر میں) لیکن اس ڈائری کے آخری صفحے پر کچھ اور بھی لکھا ہے اور یہ ابو جی کی تحریر ہے میں اسے پڑھتا ہوں۔ (صفحے پلٹنے کی آواز)۔

عدیل: مراق میرے بیٹے۔ یہ ڈائری میں جان بوجھ کر اس بریف کیس میں چھوڑتا ہوں۔ اب تم جان گئے ہوں گے کہ تمہاری ماں ایک پاک دامن اور عظیم عورت تھی۔ میری ہمت نہیں پڑتی ہے کہ تمہاری غلط فہمیاں دور کر سکوں۔ اس لیے اس ڈائری میں اپنی بات بھی لکھ رہا ہوں اور معافی بھی مانگ رہا ہوں۔ تمہاری نئی ماں تمہیں غلط فہمیوں کے دلدل میں دھکیلتی رہی اور مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ لیکن جب مظالم بڑھتے گئے مجھے اس کو طلاق دینا پڑی۔ وہ ایک بری عورت ہے تمہاری ماں کیا بن سکتی تھی۔ تمہاری غلط فہمی جیتے جی دور نہیں کر پایا۔ اس کے لیے شرمندہ ہوں۔ زندگی نہ جانے کب ساتھ چھوڑ دے گی۔ اس لیے ڈائری کے آخری صفحے پر اپنی بات رقم کر رہا ہوں۔ تمہارا ابو۔

-----اختتام-----